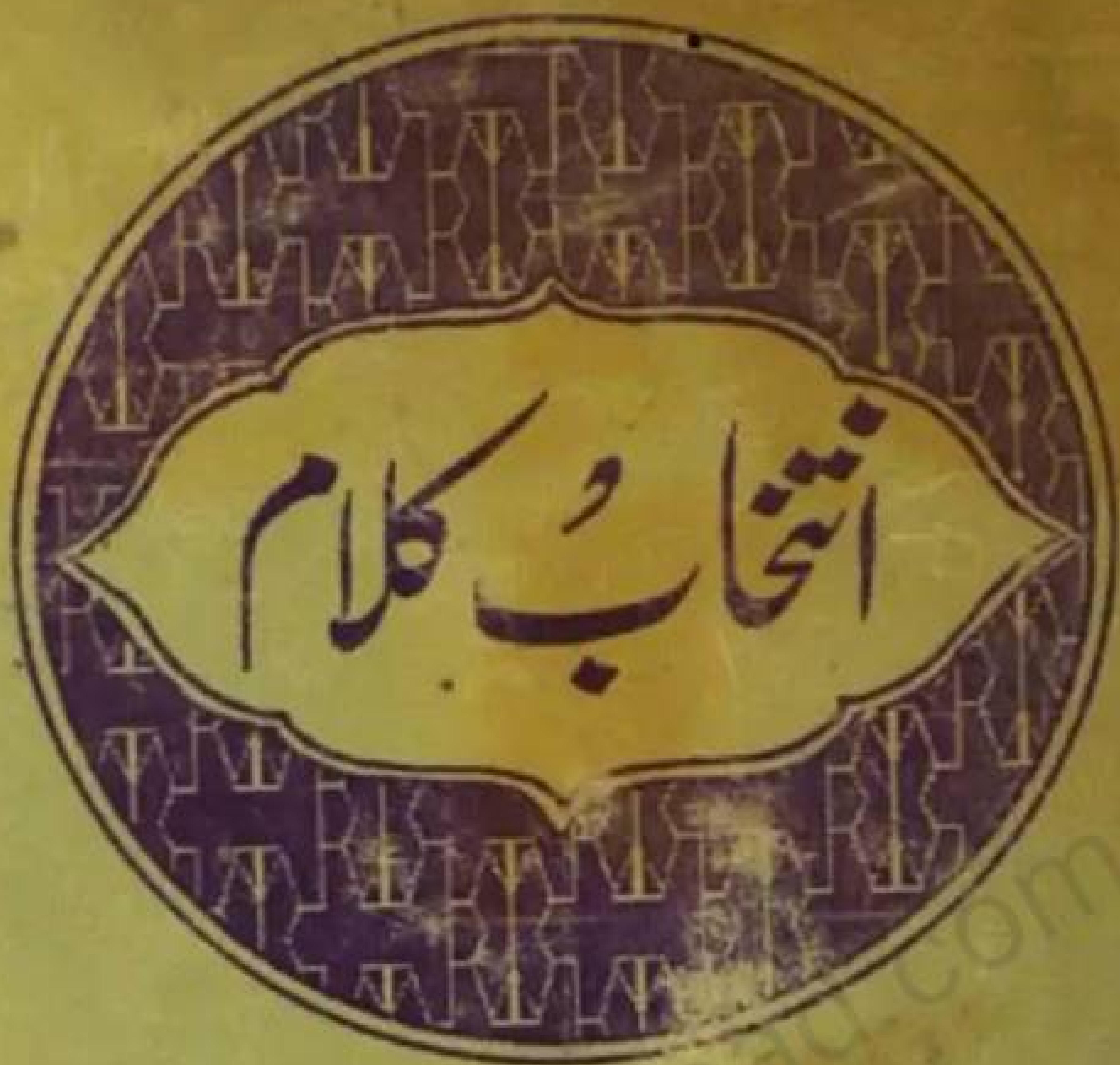


٭ قائم چاندپوری ٭ تسکین دہلوی

٭ مرزا غالب ٭ راز یزدانی

٭ بیدار

رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز

۱۹۷۰ء

انتخابِ کلام

* قائم چاندپوری * تسکین دہلوی
* مرزا غالب * راز یزدانی
* بیدار

رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز

۱۹۷۰ء

سال اشاعت: ۱۹۷۰ء

قیمت: ایک سو روپے (۱۰۰/-)

ناشر

رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز ۱۸۰۶ کلاں محل

دہلی ۶

مطبع

کوہ نور پریس، لال کنواں، دہلی ۶

انتساب

——— اعجاز کے نام

جو کچھ کہ اس میں ہو شادی و غم، غنیمت ہے
تو بے خبر ہے اس عالم سے دم غنیمت ہے

بے شغل نہ زندگی بسر کر
گر اشک نہیں تو آہ سر کر

یاں بسکہ خلاف ہے ہر اک فہم کی راہ
متروک کسی کا، ہے کسی کا دلخواہ
مجبور ہیں بے چارے سب اس صورت میں
تقصیر نہ سنی کی، نہ شیعہ کا گناہ

قائم نماز عشق بتاں منصب تو نیست
اے بے خبر ز خون خود اینجا وضو کنند

قائم دل وحشئ طلب کن
کز ہر دو جہاں رمیدہ باشد

تقریب:

میں اس سے بحث نہیں کروں گا کہ قائم کا نام قیام الدین علی تھا، محمد قیام الدین تھا یا محمد قائم تھا؛ نہ میں اس بات کی کھوج لگاؤں گا کہ قائم سنی تھے یا شیعہ؛ یا دونوں مسلک اختیار کیے تو کتنے کتنے دن کے لئے۔ میری رائے میں ان میں سے کوئی ایک بات بھی ثابت ہو جائے تو نظام شمسی پر شاید کوئی خاص اثر نہیں پڑیگا۔ شاعری کے نقص یا خوبی کے سلسلے میں سنی قائم شیعہ قائم کے مقابلے میں اور محمد قائم، قیام الدین علی قائم کے بالمقابل کوئی ایسا کرشمہ نہیں دکھا سکیں گے جس سے ان ناموں میں سے ایک یا ان مسالک میں سے ایک کے حق میں دنیا کی رائے کو ہموار کیا جا سکے۔

قائم کے بارے میں ان کے معتبر معاصرین اور ملنے والوں نے، اور صرف دو ایک بعد کے ایسے آنے والوں نے جنکے بیانات معلومات میں اضافہ کرتے ہیں اور معاصرین کا سا استناد رکھتے ہیں، قائم کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ضروری حصہ اردو لباس میں جوں کا توں پیش کر دیا گیا ہے۔ شاید حسرت [illegible] کے مصنف نے پہلی بار دبی زبان سے قائم کی شاعرانہ برتری کا اعتراف کیا ہے! اور بالکل کھلے طور پر کریم الدین نے، کہ "بعض بعض آدمی جو کہ اس کو سودا سے بہتر کہتے ہیں حق یہ ہے کہ سچے ہیں"؛ حالانکہ آب حیات کے مصنف نے تو قائم پر فٹ نوٹ میں چار سطریں لکھنے کے سوا کسی بھی درجہ کا مستحق نہ سمجھا۔ متاخرین میں میرزا غالب نے البتہ خوب خوب داد دی ہے، بکھلم کھلا بھی اور قائم کے اشعار پر تصرف کر کے بھی۔ اب اطرف منعم سعیدی (نگار اگست، ستمبر ۱۹۲۸ء) اور انکے بعد مجنوں گورکھپوری نے قائم کا صحیح مرتبہ متعین کرنے میں ادبی دیانتداری کا حق ادا کیا ــــ اور اب تو کیفیت ہے کہ ہندستان میں بیک وقت دو اسکالر، پاکستان میں تین اسکالر اور پھر اٹلی میں بھی ایک صاحب، قائم کا دیوان ایڈٹ کر رہے ہیں ــــ قائم کے دیوان کے قلمی نسخے رام پور، کراچی (انجمن)، کلکتہ (ایشیاٹک سوسائٹی)، لکھنؤ (مسعود حسن رضوی) اور لندن (انڈیا آفس) میں محفوظ ہیں۔ خوب چند ذکا (عیار الشعرا قلمی ۴۵ شعر) شاہ کمال (مجمع الانتخاب، قلمی)، عماد الملک، اور حسرت کے انتخابات کے علاوہ قائم کے اشعار کا ایک انتخاب محمد علی خاں اثر مرحوم نے اپنے ایک مضمون کے ذیل میں معارف (اپریل، جون ۵۲ء) میں شائع کیا تھا۔

مکمل متن کی اشاعت کی اہمیت اپنی جگہ پر ہے خاصکر قائمؔ ایسے شاعروں کے لیے جن سے لغت اور زبان کی سند لی جائیگی اور جن کے متن کے بغیر ہماری لغات ناقص رہینگی۔ لیکن فضول گوئی اور اس لیے فضولیات کی اشاعت کوئی پسندیدہ چیز نہیں۔ دنیا کے سامنے صرف وہ چیز آنی چاہیے جو علم میں یا مسرت میں اضافہ کر سکے محض شاعری یا محض ادب کا قدیم نمونہ ہونا اس کے لئے کفایت نہیں کرتا کہ ہر قدیم چیز چھاپ کے ذہنوں کو اور بوجھل بنایا جائے۔ اسی لیے میں نے انتخاب کو ترجیح دی ہے ــــ انتخاب کے متن کی پیش کش میں بھی اُسی اصول کے تحت، کہ دوسرے کو کم سے کم بوجھ مارا جائے، اختلاف نسخ قسم کی چیزوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے حالانکہ متعدد مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں کی موجودگی نے ۲۵ ــ ۳۰ ـ اختلافات نسخ ضرور مہیا کر دیئے تھے۔ خیر میں نے صرف اتنا کیا کہ بہتر قرارت کو ترجیح دے دی ــــ پہلی بات، جان اشعار کو پڑھ کر آپ پر خود بھی واضح ہو جائیگی یہ ہے کہ ان میں اٹھارھویں صدی کے آخری نصف تک کی جمع ہوئی شمالی ہندستان کے متوسط طبقہ کی ساری دانشمندی کے اکثر پرت مل جاتے ہیں۔ اسی لیے قائمؔ کے یہاں چمن اور بلبل، کانٹے اور پھول کے استعارے اپنے اکثر معاصرین سے زیادہ زندہ ہیں ــــ اور شاید اسی لیے بہت سے "غیر غزلیہ" الفاظ کو بڑے سلیقہ سے استعمال کیا ہے۔ ــــ دوسری بات یہ ان میں زندگی گزارنے کا اپنا ایک سلیقہ بھی ملجاتا ہے۔ ان میں کوئی فلسفہ نہیں کوئی باقاعدہ نظام حیات نہیں لیکن جگہ جگہ "قلندری" اور "وارستہ مزاجی" پر زور اور قلندر بننے کے جذبہ کو جس پر خلوص طریقہ سے ادا کیا ہے، اس سے بجا طور پر شبہ ہوتا ہے قائمؔ نے قلندری کو ایک اہم علامیہ کے طور پر استعمال کیا ہے ان اشعار کو ذرا اس نظر سے پڑھیے گا۔

تیسرے یہ کہ قائمؔ کے ان اشعار کو پڑھتے پڑھتے آپکو متعدد ایسے اشعار یا مصرعے مل جائیں گے جو یا تو ضرب المثل ہو گئے ہیں یا ہونیکی صلاحیت رکھتے ہیں ــــ چوتھے یہ کہ قائمؔ کے شعر پڑھتے وقت ہر صفحے پر ایک دو شعر آپکو ایسے مل جائیں گے جنھیں پڑھ کر غالب، داغ، فیض یا بعض اور مشاہیر شعرا کے شعر ذہن میں گھومنے لگیں گے۔

مرزا غالب

مکتوب بنام عبدالغفور سرور

مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم

ورائے شاعری "چیزے دگر" ہست

وہ "چیزے دگر" حصّے میں پارسیوں کے آئی ہے۔ ہاں اردو زبان میں اہلِ ہند نے وہ چیز پائی ہے۔

میر: بدنام ہو گے جانے بھی دو امتحان کو ؎ رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

سودا: دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار ؎ خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنسِ گراں کا

قائم: قائم اور تجھ سے طلب بوسے کی کیوں کر مانوں ؎ ہے تو ناداں مگر اتنا بھی بد آموز نہیں

مومن: تم مرے پاس ہوتے ہو گویا ؎ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا"

ایضاً ——— مکتوب بنام غلام غوث بےخبر

"جناب عالی! ایک شعر استاد کا مدت سے تحویلِ حافظہ میں چلا آتا ہے:

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر   روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا

میں نے از راہِ تصرف اس شعر کی صورت بدل ڈالی:

ان دل فریبیوں سے نہ کیوں اس پہ پیار آئے   روٹھا جو بے گناہ تو بے عذر من گیا"

میرا خیال ہے غالب کی تحویلِ حافظہ میں قائم کے مندرجہ ذیل شعر بھی تھے اور از راہِ تصرف ان اشعار کی صورتیں بھی بدل ڈالی ہیں جو ان کے دیوان میں موجود ہیں:

کوئی اپنی خاطر ایسا کہیں اک مکان ہووے   کہ نہ یہ زمین ہووے نہ یہ آسمان ہووے

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے   کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

خاک ہے اس مہرِ گردِ دل پر کہ یوں ماتی کے بیچ   صورتیں کیا کیا دیں اتنی خرم و شاداب داب

وہ گریہ آہ جو تھا موجزن گریباں تک   سو آج دامنِ مژگاں بھی اس سے تر نہ ہوا

تو دل کو ڈھونڈھے ہے سینہ میں اب تلک ظالم   کبھی کا خون ہو آنکھوں سے گر گیا ہو گا

جزو و کل ایک ہے جوں قطرہ و بحر   بہت اس رمز کو کم جانتے ہیں

قائمؔ ہو کس طرح سے بہم شکل اختلاط
وہ اوس غرور ناز میں یاں اس حجاب میں

اہلِ مسجد نے جو کافر مجھے سمجھا تو کیا
ساکنِ دیر تو جانے ہے مسلماں مجھکو

اس چمن میں دیکھیے کیونکر بسر ہووے نسیم
ہے مزاج نکہت گل شوخ اور ہم بے دماغ

وہ دن گئے کہ اٹھاتے تھے ناز نکہت گل
ہے بے دماغی دل ان دنوں گراں مجھکو

دل کے تابع ہیں جو ہوا سو کیا
ہم سمجھتے نہیں عذاب و ثواب

سچ ہیں سارے کمال حضرت شیخ
لیک دل کو کچھ اعتقاد نہیں

بیکسی اپنی کس کو سونپ مروں
میں تو رکھا تھا اس کو جاں کی طرح

ع ہوا ہے تار نفس رشتۂ پر پرواز

ع دیکھو رہے ہے گریہ کا یہ رنگ کب تلک

دم قدم تھی ہمارے ہی جنوں کی رونق
اب بھی کوچوں میں کہیں شور و فغاں سنتے ہو

ع ای خستہ بیں کہ رہ بمسیحا نمی کنند

ع شوق بیعرفہ بکویش دگر آورد مرا

قائمؔ رفتنت چہ کشاید کہ دریں عصر
عیب است اگر کس ہنرے داشتہ باشد

از ما سخن ز دام و قفس می تواں شنید
ما گل ندیدہ ایم و ندانیم باغ را

ای من دای سرو ای طشت بیا بسم اللہ
من نہ آنم کہ ز تیغ تو حذر می خواہم

قائمؔ امروز اگر رونق سخن نیست چہ شد
آخر ای جنس بیکروز گراں میگردد

خود نوشت

(۱۱۶۸ھ / ۱۷۵۴ء)

مخزن نکات

آلودہ انواعِ جرائم فقیر مولف قیام الدین قائمؔ ہرچند باشندگانِ قصبہ چاند پور سے ہے لیکن آغازِ شعور سے اس وقت تک بادشاہ کی نوکری کے توسل سے دارالخلافت شاہجہاں آباد میں بسر کی ہے اور اپنے روز و شب بمقتضائے مناسبت، سخن سنجان عالی قدر کی صحبت میں گزارے ہیں۔ اس طرف جو کچھ عرصے سے انقلاب سلطنت کے اثرات کے تحت سارے بادشاہی انتظام ہی میں خلل آگیا، تو ہر موتی جیسی آب رکھنے والا قعرِ مذلت میں گر گیا اور جدھر جس کا منہ اٹھا چل دیا۔ ناچار، بلکہ بے اختیار ہو کر سفر کو اقامت پر ترجیح دینی پڑی۔

میں نے جو فرصت پائی اسے غنیمت جان کر ارادہ کیا کہ ہر ایک کا کچھ نہ کچھ روزنامچہ اعمال اور کچھ احوال قلمبند کرتا رہوں جو دوستوں اور عزیزوں کی جدائی میں مونسِ تنہائی بنے۔ اور خاصی کوشش کے بعد قدما اور معاصرین کے حالات اور اشعار لکھے —— چاہتا تھا کہ ان معزز اشعار کے ساتھ اپنے بارے میں کچھ نہ لکھوں اور ہوس سے پُر دل کو اس سے باز رکھوں کہ ستاروں کی روشنی روشن چاند کی موجودگی میں معدوم کا درجہ رکھتی ہے اور ذرہ کا جادہ خورشید درخشاں کے سامنے معلوم! تاہم بمناسبت کلیہ استاد کہ ؎

بدریائے لؤلؤ صدف نیز ہست   درختے بلند است درباغ و پست

جسارت کرتا ہوں۔ اور یہ قائمؔ کے اشعار ہیں:۔ (پھر صرف۔ الف کی ردیف کی آٹھ غزلوں سے ۳۲ شعر نمونے کے طور سے نقل کیے ہیں ان اشعار کے اشارے یہ ہیں:۔

شام رہ گیا۔ کام رہ گیا۔ بام رہ گیا۔ الزام رہ گیا؛ طوفاں بدوش تھا۔ بتخانہ بردوش تھا۔ خموش تھا۔ گزر کر گیا۔ سفر کر گیا۔ سحر کر گیا۔ بینائی کا۔ تنہائی کا۔ رسوائی کا؛ پر نہ گیا۔ تر نہ کیا۔ مر نہ گیا

سفر نہ کیا۔ درد سر نہ کیا۔ بیشتر نہ کیا۔ چشم تر نہ کیا۔ ور نہ کیا۔ بنایا نہ جائیگا۔ خار ماہی کا۔ روسیاہی کا۔ بادشاہی کا۔ سنبھل جاؤں گا۔ مچل جاؤں گا۔ سنبھل جاؤں گا۔ جل جاؤں گا۔ بھر آئے گا۔ اٹھائے گا۔ کہیں تو جائے گا۔)

میر

(۱۱۶۵ھ/۱۷۵۱ء)

نکات الشعراء

محمد قائم متخلص بہ قائم۔ ایک جوان ہے خیرہ وطیرہ حسن پرست، اور لوکر پیشہ۔ ایک عرصے تک میاں خواجہ میر (درد) کے جرگے میں رہا۔ اب مرزا رفیع (سودا) کے ساتھ محشور ہے مجھ سے بھی ملاقات ہے۔

میر حسن

(۱۱۹۱ھ/۱۷۷۷ء)

تذکرہ شعرائے اردو

ابتدائے جوانی ہی سے شاہ جہاں آباد آگیا تھا اور یہیں ایک زندگی گزاری، اس لیے محاورہ درست ہوگیا۔ میں نے اسے دیکھا نہیں مگر اس کی خوبیاں سنی ہیں۔ آجکل سنبھل مراد آباد میں ہے خدا اسے سلامت رکھے۔

مصحفی

(۱۲۰۹ھ/۱۷۹۵ء)

تذکرہ ہندی

قیام الدین علی عرف محمد قائم، قائم تخلص۔ اگرچہ وطن قصبہ چاند پور ہے مگر بادشاہی

نوکری کے توسل کے سبب اکثر شاہ جہاں آباد ہی میں رہا اور اس زمانے میں توپخانہ میں بھی کوئی ملازمت کی تھی۔ موزونیِ طبع اور استعدادِ درست کے تقاضے سے جو کچھ موزوں کرتا میرزا رفیع (سودا) کو دکھا لیتا۔ خواجہ میر درد سے بھی عقیدت تھی۔ فقیر نے اسے ایام ذدوگی (؟) میں لباس درویشی کے اندر نواب محمد یار خاں کے یہاں دیکھا جب کہ وہ تازہ وارد ہی تھا۔

پختگیٔ کلام، غزل کے مصرعوں کی چستی اور قصیدہ اور مثنوی وغیرہ کے انداز میں رواج زمانہ کے موافق استاد کے دوش بدوش نظر آتا ہے ــــ اور بعض جگہ تو استاد سے اونچا اٹھ جاتا ہے۔ ان دنوں نواب محمد یار خاں کے یہاں مؤلف کے قصیدہ پڑھنے اور پھر نوکر ہونے کے زمانے میں قائم کا بڑا مرتبہ تھا۔ فقیر کے ساتھ تھوڑے عرصے میں سلامت طبع، اور شاعری کی مشترک نسبت کے سبب خاصا ربط ہو گیا۔ نواب کے اشعار کے مسودے جو اصلاح کے لیے اس کے پاس آتے اپنی کم دماغی کے سبب فقیر کو مشورے کے لیے دے دیتا۔ چنانچہ تین مہینے ہمارے اسی طرح یکجا گزرے اور شام و چاشت ایک سفرہ میں ہوئی۔ خدا کی قسم اس صحبت کی یاد آتی ہے تو دل پر ناکامی کا ایک داغ چھوڑ جاتی ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ کٹھیر کے اجڑنے کے بعد فیض اللہ خاں رام پور والے کا نواب احمد یار خاں صاحب پسر نواب محمد یار خاں کی جاگیر پر قبضہ ہونے کے بعد کچھ حالات سدھرے۔ مگر پھر فراغت نصیب نہ ہوئی۔ لہٰذا اس قصبہ کی (چاند پور ؟) قدیم ملک اور دیہات کی واگزاشت کے لیے اور روپیہ وغیرہ کے لیے لکھنؤ آیا اور راجہ ٹکیت رائے بہادر سے اس جگہ کے عامل کے نام شقے اور پروانے حاصل کیے اور واپس پہنچا، مگر اپنے مطلب پر فائز ہوا ہی تھا کہ رام پور میں مقرر وقت، آ گیا اور اس کی وفات کی خبر شہر شہر پھیل گئی۔

"

قدرت اللہ شوق سنبھلی، رامپوری

(عہد قائم)

طبقات الشعراء

محمد قائمؔ - مزے دار آدمی ہے، درد مند، متواضع، خلیق، مہذب صورت اور پاکیزہ سیرت۔ نہایت پرگو، اور خوش مقال، اور سخنوری میں باکمال ہے ...... بہت سے دوست اس کے فیض صحبت سے شاعری کے بلند مرتبہ تک پہنچ گئے ...... اس ہیچمداں کے حال پر بھی نہایت شفقت کرتا ہے۔ اکثر محفل جمتی ہے اور خوب گپ بازی ہوتی ہے۔ کچھ مدت سے نواب محمد یار خاں امیر کی رفاقت میں ہے ۔ ۔ نواب صاحب موصوف نے مشق سخن قائم ہی سے کی اور چند دنوں میں بڑی بلندی پر پہنچ گئے۔

ایضاً

(قائم کے بعد)

تکملۃ الشعرا (قلمی)

گاہے گاہے فارسی بھی کہہ لیتا تھا۔ اس کی زبان سے سنی ہوئی بعض غزلوں کے کچھ شعر درج ہیں ...... بڑا خوش فکر شاعر تھا۔ چند سال ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ وفات رام پور میں ہوئی، قبر نواب محمد یار خاں کے مقبرے کے متصل ہے۔

شاہ محمد کمال

(۱۲۱۸ھ/۱۸۰۰ء)

مجمع الانتخاب (قلمی)

فقیر، ...... شاہ محمد کمال ولد سید قادر نواز خاں، ...... چودہ سال کی عمر تھی ... کہ فیض آباد پہنچا اور ...... چار سال بعد لکھنؤ آیا ...... میاں محمد قائم صاحب جو مسلم الثبوت شاعر اور مرزا صاحب مرحوم مرزا رفیع سودا کے شاگرد رشید تھے، ان سے مشق سخن کی۔ ...... اب

جو غزل ہوتی میاں شاہ محمد قائم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں گزرانتا اور اصلاح لیتا۔ ...... چند سال بعد میاں محمد قائم صاحب، نواب فیض اللہ خاں افغان کے بھتیجے نواب احمد یار خاں صاحب کے حسب الطلب رام پور کے لیے روانہ ہو گئے۔ چلتے وقت ...... فقیر نے سوال کیا کہ اب فقیر کا شعر کہنا تو ختم ہوا کس سے مشقِ سخن کہوں گا؟ اس پر ...... فرمایا کہ میاں قلندر بخش جرأت سخن سنجوں میں بے نظیر اور معنی آفرینوں میں بے مثال ہے تمہیں اپنی غزل انھیں دکھانا چاہیے ......

قلندر بخش جرأت

(قبل ۱۲۱۸ھ)

کلیات قلمی۔ علیگڑھ

شاہ کمال

(۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء)

نمونۂ اشعار جرأت (تذکرہ مجمع الانتخاب (قلمی))

جب سیل فنا ملک حوادث میں بہی آکر ناگاہ
قائم کے جو تن کی عمارت سو ڈہی لی زیست کی راہ

جرأت نے کہی رو کے یہ تاریخ وفات یکتائی کے ساتھ
قائم بنیاد شعر ہندی نہ رہی کیا کہیے اب آہ

عنبر شاہ خاں آشفتہ رامپوری

(۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱ء)

دیباچۂ دیوان اردو (قلمی)

عنفوان شباب میں ...... خصوصاً صاحب سرِ دفتر شعرائے ہندوستان ...... قیام الدین محمد قائم کی خاطر خواہ تھی۔ اور منادمت ... مختار شاعر و یگانہ تھی۔ بزم لطافت انگیز اس رئیس شاعران بے مثل میں شب و روز سوائے شعر و شاعری کے اور مذکور نہ تھا ...... اور ہر دم ...... در ریزی غزلخوانی ...... میرزا جان جاں مظہر، ...... اور خواجہ میر درد، اور سراج الدین علی خاں آرزو۔ اور ... میر محمد تقی، اور ... مرزا رفیع سودا، اور دیگر احیا و اموات ......

ترمیں خیالات دلکش شاہجہاں آباد کی سنے از دیاد اشتیاق ریختہ گوئی ہوتی ...... چنانچہ بحسب اتفاق ایک دن
...... گزارش کیا کہ اگر اجازت ہوئے بندہ بھی گاہ گاہ دو چار بیت مبتذل قلمبند کر کے سامعہ خراش ملازموں کا ہو
فرمایا کہ "ہم نے مشق جہل سالہ بلند پروازی طائرانہ تفکر میں کیا آسمان سے تارے توڑے کہ آپ توڑیں گے، اور......
کون سے ذخیرے زر و سیم کے جوڑے کہ آپ جوڑیں گے؟ اولیٰ و انسب یہ ہے کہ تحصیل ضوابط انشاء و تکمیل
روابط طب کا ارادہ صحیح و مساعی پیش نظر رہے کہ منشیٔ واثق و طبیب حاذق جہاں رہے مشیر و ندیم تونگر رہے"۔

تتمہ

• چاندپور ضلع بجنور کے محمد اکرم کے بیٹے محمد ہاشم تھے۔ محمد ہاشم کے دو بیٹے تھے بڑے محمد منعم منعمؔ، چھوٹے محمد قائم قائمؔ —— قائمؔ جن کی جوانی دلّی میں گزری اور پیری رام پور میں۔ قائمؔ نے دو شادیاں کیں، ایک دلّی میں، دوسری چاندپور میں۔ بہانہ پور والی بیوی سے انکی نسل میں ان کے پرپوتے مولوی شاہد حسن علوی قائمؔ کے والد کے بنوائے ہوئے مکان میں چاندپور میں کم سے کم ۱۹۵۲ء تک رہتے تھے، یہ اثر رامپوری مرحوم کا بیان ہے (معارف، اپریل ۱۹۵۲ء)
قیام رامپور کے سلسلہ میں اثر صاحب نے لکھا ہے کہ: "دلّی کے بعد قائمؔ آنولہ کے قریب ٹانڈے میں رہے۔ ۱۱۸۸ھ میں فیض اللہ خاں محمد یار خاں کو رامپور لے آئے اور انکی سکونت کے لیے کرم خاں رزڑ کا مکان جو موجودہ قلعہ کے مشرقی جانب انگوروالی مسجد کے متصل تھا، عطا کیا اور تفریح کے لیے کرم خاں رزڑ کا باغ مرحمت ہوا جو اب انگوری باغ کہلاتا ہے۔ ان کے ساتھ قائمؔ چاندپوری بھی آئے لیکن قیام رامپور کے چند ہی مہینے بعد نواب محمد یار خاں کا یکم ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ کو انتقال ہو گیا۔ اس وقت ان کے بیٹے نواب احمد یار خاں افسرؔ کی عمر ۱۱ سال کی تھی۔ قائمؔ ان کے استاد کی حیثیت سے ایک مدت تک رامپور میں رہے۔ رامپور ہی کے زمانہ قیام میں مولوی قدرت اللہ شوقؔ، قائمؔ کے شاگرد ہوئے۔ آخر میں نواب احمد یار خاں کی ناقدری نے انھیں لکھنؤ جانے پر مجبور کیا۔ جب وہ لکھنؤ سے اپنے وثیقے اور جائداد کی واگزاشت کا پروانہ لیکر لوٹے تو رام پور میں اترے اور اس ارادے سے اترے کہ اب رامپور سے کبھی نہ جائیں گے۔

•• ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء میں رام پور میں آمد کے سلسلے میں اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ رام پور کی بنیاد فیض اللہ خاں کے ہاتھوں ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء میں پڑی جب روہیلوں کے خلاف اودھ۔ انگریزی متحدہ

جنگ کے بعد معاہدہ لال ڈانگ کے نتیجہ میں روہیلہ حکومت کے بانی علی محمد خاں کا سارا علاقہ اودھ کی حکومت کے زیر نگیں عطا کر دے دیا گیا اور صرف رام پور کی ریاست جس کے شمال میں ترائی کا علاقہ ہے، جنوب میں بدایوں، مشرق میں بریلی اور مغرب میں مراد آباد، علی محمد خاں کے بیٹے فیض اللہ خاں کو دیدی گئی۔ محمد یار خاں ان کے بھائی تھے محمد یار خاں اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ اس سے پہلے آنولہ کے مضافات میں رہتے تھے. آنولہ روہیلہ سلطنت کا دارالحکومت تھا۔ جب اس حکومت کے پاسبان حافظ رحمت خاں حکومت اودھ کی غداری سے شکست کھا کر شہید ہو گئے تو بھتیجے سرپرست سے محروم ہو کر بالآخر رامپور میں سمٹ آئے۔

••• ایک فضول سی روایت کی بھی تردید کرنی ہے جو قدرت اللہ قاسم نے تذکرہ "مجموعہ نغز" میں لکھی ہے کہ ابتداء سخن ہدایت کی شاگردی سے ہوئی، پھر درد کے یہاں پہنچے اور پچھلے استاد کی ہجو لکھی:

شاعری کا اسے آیا ہے بہت سا غرّا — جو یہ کہتا ہے وہ استاد زماں سنتے ہو

ام ہو دے تو ہدایت کو کروں میں سیدھا — واں سے ارشاد ہوا یہ کہ میاں سنتے ہو

راست ہوتے ہیں کسی سے بھی کہیں کج طینت — تیر ہوتی ہے کہیں شاخ کماں سنتے ہو

اس پر ہدایت نے لکھا:

چشم انصاف سے دیکھو تو میاں قائم تم — چاہیے یوں کہ ہدایت کو اب استاد کرو

اور جو کچھ شاعری کا دل میں تمہارے ہو گھمنڈ — کہہ چکے ہم تو غزل بارے تم ارشاد کرو

پھر لکھا ہے کہ سودا کی شاگردی اختیار کی اس سے بھی منحرف ہوئے. سودا نے ایک ہجو یہ ساقی نامہ لکھ ڈالا مگر قائم کے رجوع کرنے پر ایک فرضی تخلص فوقی قائم کی جگہ ڈال دیا۔

محض ہدایت کی شاگردی کا تذکرہ خوب چند ذکا نے بھی کیا ہے۔ ذکا کا تذکرہ ۱۲۱۸ھ کا ہے اور قاسم کا ۱۲۲۱ھ کا۔ یعنی دونوں ہیں بعد کے۔ سودا کی حکایت کے بارے میں، میں کچھ نہیں کہتا، اس میں کچھ جان ہے بھی نہیں۔ لیکن ہدایت کے سلسلے میں جو بکھیڑا پھیلا ہے وہ یقینی طور سے میر کا تذکرہ "نکات الشعرا" لکھے جانے سے پہلے کی بات ہونا چاہیے کہ میر نے سودا کو استاد بنایا ہے۔ اور میر جو اس قسم کی ہر بات سے واقف ہوتے، اور اس کے ذکر سے کبھی نہ چوکتے، انھوں نے قائم کے اشعار کے ذیل میں اسی زمین میں صرف یہ شعر دیئے ہیں اگرچہ (قائم کے مندرجہ اشعار میں ہدایت والے شعر کو چھوڑ کے باقی وہ شعر نسخہ مسعود حسن رضوی میں بادنیٰ اختلاف موجود ہیں)۔

سنگ کو اب کریں پل میں ہماری باتیں — لیکن افسوس یہی ہے کہ کہاں سنتے ہو
میں کہا خلق تمہاری جو کمر کہتے ہیں — تم بھی کچھ اس کا کہیں ذکر و بیاں سنتے ہو
ہنس کے یوں کہنے لگا خیر اگر ہے یہ بات — ہوئے گی ویسی ہی جیسے کہ وہاں سنتے ہو

خود قائم نے اپنے تذکرہ "مخزن نکات" میں ہدایت کا ذکر ۱۱۶۸ھ میں ان الفاظ میں کیا ہے:

"میاں ہدایت اللہ ہدایت زاد بوم دہلی ہے۔ خواجہ میر درد کے شاگرد اور مرید ہیں، اور بے نہایت استغنا کے ساتھ گزارتے ہیں۔ کسی در پر آبرو نہیں بیچتے۔ افغانوں میں اس کردار اور حال کا آدمی کوئی نہ اٹھا۔ لالہ سدھ رائے پیشکار خالصہ شاہی کچھ تواضع کرتا ہے اور اس کی قبولیت اپنے سر لیتا ہے۔ سکونت میرے پڑوس ہی میں ہے۔"

اس شخص کے بارے میں قدرت قاسم کی حکایت کی کیا بنیاد رہ جاتی ہے؟ مگر قاسم کو آخر فائدہ بھی کیا تھا!!

عابد رضا بیدار

۳۱/۵/۶۳

فارسی شعر

قدم از دیدہ ام بر داشتی و ترک سر کردم
نباشی بے خبر از حال مشتاقاں خبر کردم

باز می خواہیم در کوئے بتاں داوے کنیم
دامن تر را ابر دگیریم و فریادے کنیم
شاید لئے قائم کسے آنجا بداد من رسد
دست دل گیریم و ہر سو داد بیدادے کنیم

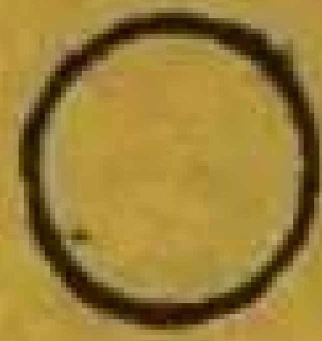
آناں کہ با حلاوت درد لتو خو کنند
نسخے بدل زنند و نمک آرزو کنند
رہگذر زیارہ دوزی زخم دل اے رفیق
کیں چاک سینہ نیست کہ آں را رفو کنند

آں کس کہ بہ زلف تو سرے داشتہ باشد
از روز سیاہم خبرے داشتہ باشد

شب کہ انداز ہم آغوشی او یاد کنم
خویش را تنگ ببر گیرم و فریاد کنم

نباشد رہن فصل نو بہاراں برگ و بار من
کہ نخل آتشکم و در سوختن باشد بہار من
دلم از شیون بلبل بخاک و خون فتاد اکثر
نمی گفتم کہ ظالم گل بیفشاں بر مزار من
خس افتادہ در سیلم چہ می پرسی ز احوالم
بدست دیگرے باشد عنان اختیار من
مرا از صبح وصل او چہ حاصل زانکہ میدانم
نباشد روز روشن در پس شبہائے تار من
کجائی اے نسیم صبح یکدم دستگیرم شو
کہ عزم کوئے او آرد عمرہا دارد غبار من
جہاں یکسر ز آب دیدۂ من غرق طوفاں شد
نمی دانم چہ خواہد کرد چشم اشکبار من
ز بس در دیدۂ و دل نقش روشن کردہ ام قائم
بہر سو میروم آں شوخ باشد در کنار من

چساں نہ لاف خدائی زنم کہ کردی قائم
بہ بندگان خود آں بت شمار کرد مرا
بنود جنس من از دست ادنی قائم
زمانہ قدر ندانست مفت باخت مرا



ہر گز نہیں مقدور، تری حمد، زباں کا
برہان ہے دعوے کی مرے عجز زباں کا

جب تک کہ ہے تو، ہم ہیں ترے ساتھ ہمیشہ
جیوں موج، کہ نت لازمہ ہے آبِ رواں کا

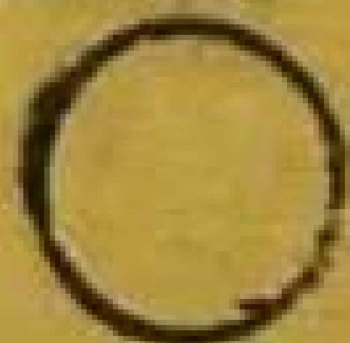
اے عشق مرے دوش پہ تو بوجھ رکھ اپنا
ہر سر متحمل نہیں اس بارِ گراں کا

تک فہمِ ارادت سے برہمن کے سمجھ شیخ
کیا کم ہے خدا سے ترے ہنگامہ بتاں کا

دل پردے میں کہہ رمزِ حقیقت کہ مبادا
محرم ہو کوئی غیر ترے رازِ نہاں کا

اے غافلِ فرصت، یہ چمن مفت نظر ہے
پھر فصلِ بہار آئے نہ موسم ہو خزاں کا

پوشیدہ ہے جیوں بو، وہ ہر اک رنگ میں قائم
دیکھے تو اگر غور سے گلزار جہاں کا



دل پا کے اس کی زلف میں آرام، رہ گیا
درویش، جس جگہ کہ ہوئی شام، رہ گیا

ناپختگی کا اپنی سبب اس ثمر سے پوچھ
جلدی سے باغباں کی جو خام رہ گیا

جھگڑے میں ہم مبادی کے یاں تک پھنسے کہ آہ
مقصود تھا جو اپنے تئیں کام، رہ گیا

قسمت تو دیکھ، ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

نے تجھ پہ وہ بہار رہی اور، نہ یاں وہ دل
کہنے کو نیک و بد کے اک الزام رہ گیا

قائم گئے سب اس کی زباں سے جو تھے رفیق
اک بے حیا، میں، کھانے کو دشنام رہ گیا



جی تلک آتشِ ہجراں میں سنبھالا نہ گیا
گھر میں سب کچھ تھا، پہ ہم سے تو سنبھالا نہ گیا

اوچھل اس ہستی کے تنکے کے یقینی تھا پہاڑ
ہو پرِ کاہ ہی پر نظروں سے ٹالا نہ گیا

گو کہ دیتا تھا فلک، مول کے دل کے، دو جہاں
اتنی قیمت پہ تو اس مال کو ڈالا نہ گیا

رخت باندھا نہ کس اندوہ و خوشی نے دل سے
اک ترے غم ہی کا اس گھر سے اسالا نہ گیا

کیا زر داغ نہ گردوں نے دیئے قائم کو
اوس قلندر کا پہ یک روز دوالا نہ گیا

○

ٹکڑے کب دل نے یہ جگر نہ کیا
نہ کیا، نالہ ہم نے، پر نہ کیا

دل سے طوفانِ گریہ اٹھے ہزار
ہم نے پر یک مژہ کو تر نہ کیا

خم کے خم پی گئے مئے منصور
یک اس کا سا شور و شر نہ کیا

پائے دیوار دوست یک مدت
ہم بھی کاٹی، پہ نالہ سر نہ کیا

موج گرداب کی طرح ہمنے
گھر سے باہر کبھو سفر نہ کیا

دوش کیا دیجے چرخ کو قائم
بند، گھر کا، ہیں آپ، در نہ کیا

○

عہدے سے تیرے، یار، بر آیا نہ جائے گا
یہ ناز ہے تو ہم سے اٹھایا نہ جائے گا

ٹوٹا جو کعبہ کونسی یہ جائے غم ہے شیخ
کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

آتش تو دی تھی خانۂ دل کے تئیں ہیں آپ
پر کیا خبر تھی یہ کہ بجھایا نہ جائے گا

ہوتے ترے محال ہے ہم درمیاں نہ ہوں
جب تک وجود شخص ہے سایا نہ جائے گا

ہے خواجہ آج نام کے پیچھے یہ سر خراب ‏ غافل کہ کل نشان بھی پایا نہ جائے گا

قائمؔ، خدا بھی ہونے کو جو جانتے ہیں ننگ
بندہ تو ان کے پاس کہایا نہ جائے گا



میں خوب اہل جہاں دیکھے، اور جہاں دیکھا ‏ پر آشنا کوئی دیکھا، نہ مہرباں دیکھا
ہمیشہ منع تو کرتا تھا باغ سے ہم کو ‏ کچھ حال اب گل و گلشن کا، باغباں دیکھا؟
طلب کمال کی، کوئی، نہ کیجیو زنہار ‏ کہ میں یہ کر کے فضولی بہت زیاں دیکھا
نہ جانے کونسی ساعت چمن سے بچھڑے تھے ‏ کہ آنکھ بھر کے نہ پھر، سوئے گلستاں دیکھا
سنے کو دیکھے پہ ہم دیویں، کس طرح ترجیح ‏ خدا تو ہم نے سنا ہے، تمہیں بتاں دیکھا
برنگِ غنچہ، بہار اس چمن کی، سنتے تھے ‏ یہ جونہی آنکھ کھلی موسم خزاں دیکھا

نہ کہتے تھے تجھے قائمؔ، کہ دل کسی کو نہ دے
مزا کچھ اس کا بھلا تو نے اے میاں دیکھا



اب جو کوچے سے ترے جائے گا ‏ کچھ سمجھ کر ہی پھیر آئے گا
دل کہاں تک اٹھائے جور ترے ‏ تجھ سے اب دل ہی کو اٹھائے گا
خس نمط، ساتھ موج کے لگ کے ‏ بہتے بہتے کہیں تو جائے گا
صحبت نیک و بد سے یھاں رہ کر ‏ کب تلک درد سر اٹھائے گا
جی میں ہے، ادس ہرے اس عالم کے ‏ جا کوئی جھونپڑا [illegible]ئے گا
شام تا صبح یھاں سے جب، قائمؔ ‏ یہی ٹھہری کہ مر ہی جائے گا

بس گئے دِن جو زیست ہے اس پر　　کس کی منت عبث اٹھائے گا
بند کر بیٹھیے درِ خانہ
ایسی فرصت کو پھر نہ پائیے گا



ہم بھی ہر طرح تری دوری میں دل شاد کیا　　ہچکی گر آئی تو سمجھے ہیں کہ تیں یاد کیا
کہتے ہیں یاد میں تیری وہ موا جاتا ہے　　بھول کر بھی نہ کبھی تو نے جسے یاد کیا
جس کسی نے یہ کہا تم سے، غلط، جھوٹ، خلاف　　کس کے آگے میں ترا شکوۂ بیداد کیا
چھوٹ کر دام سے ہم گرچہ رہے گلشن میں　　پر تری قید کو صیاد بہت یاد کیا
کوہ اور دشت میں بھی ہم یہ رہے آسودہ　　ماتم قیس کیا، یا غمِ فرہاد کیا
کس جگہ ڈھونڈیے قائم تجھے، اے خانہ خراب
جانیے، کون سے جنگل کو تیں آباد کیا



عیش و طرب کہاں ہیں، غمِ دل کدھر گیا　　صدقے میں اس گزشت کے، کیا کیا گزر گیا
کیا کہیے ناتوانیِ غم کی خرابیاں　　گر شب میں دل کو جمع کیا، جی بکھر گیا
بس اب کنار دل سے کر اے آرزوئے وصل　　زہرِ غمِ فراق مرا کام کر گیا
آئی بھی فصلِ گل تو ہمیں کیا، کہ ہم نشیں　　جس دل میں کچھ ہوا تھی سو اب دل وہ مر گیا
طوفان گریہ کی ہے مرے خود اک عمر نوح　　دریا نہیں کہ آج چڑھا کل اتر گیا
قائم معاملوں سے ترے زندگی ہے شاق
اے نیک روزگار، کہیں تو نہ مر گیا

پھر کے جو وہ شوخ نظر کر گیا   تیر سا اک دل میں گزر کر گیا
خاک کا اک ڈھیر سر رہ ہوں میں   قافلۂ عمر سفر کر گیا
خلد بریں اس کی ہے واں بود و باش   یہاں کسی دل بیچ جو گھر کر گیا
چھپ کے ترے کوچے سے گزرا میں لیک   نالہ اک عالم کو خبر کر گیا
تا بہ فلک نالہ تو پہنچا تھا رات   میں ہی کچھ اللہ کا ڈر کر گیا

پوچھ نہ قائم کی کٹی کیونکہ عمر
جوں ہوا یک چند بسر کر گیا

نہ جوں حباب تو دم لے حیات فانی کا   کہ بیٹھ جائے ہے یہ بلبلا سا پانی کا
نہ چھوڑ ساتھ سے اے مرغ تیز پر مجھکو   کہ تازہ ربط کیا ہے، میں پر فشانی کا
کہے ہے کل کے تو آنے کو آج یاں شب تک   کب اعتماد کسی کو ہے زندگانی کا

سوال بوسہ تو قائم کیا کر اوس سے یونہیں
کبھو تو ہوگا کوئی وقت مہربانی کا

جلوہ چاہے ہے اسے اس بت ہرجائی کا   نہ پریشاں نظری جرم ہے بینائی کا
عار ہے ننگ کو مجھ نام سے سبحان اللہ   کام پہنچا ہے کہاں تک مری رسوائی کا
ع اسی منہ سے تجھے دعویٰ تھا شکیبائی کا
صحن صحرا کو سدا اشک سے کرتا چھڑکاؤ   بس دوانہ ہوں میں قائم تری مرزائی کا

○

وہ فکر کر کہ آنکھ سے، ناصح، تھمے لہو
یوں کیا ہوا جو تو نے تنک جیب دھو دیا

اظہارِ عشق اس سے، دلا کچھ ضرور تھا؟
کیا کہیے، اپنے ہاتھ سے میں کام کھو دیا

تجھکو غرور و ناز، ہمیں عجز اور نیاز
جو کچھ کہ تھا کسی کے سزاوار، سو دیا

ہستی کا بار، یہ بھی کوئی طور ہے کہ آج
قائم نے تیرے ہاتھ سے گھبرا کے رو دیا

○

قائم اب عشق میں پھنس چک کے جو ڈھونڈے ہے نجات
کیوں تو پہلے ہی، مری جان، کنارا نہ کیا

○

مرے دماغ سے مایوس ہے نسیمِ صبا
کسی کے کوچے سے آئی مگر شمیم صبا

گلِ شگفتہ دریوزہ ہوں میں گلشن میں
زیادہ بادِ خزاں سے ہے مجھ کو بیم صبا

○

قائم تو اپنی ہستی نہ سمجھا کہاں تلک
اے خانماں خراب کوئی یہ بھی ہوش تھا

○

غیر سے ملنا تمہارا سن کے گو ہم چپ رہے
پر سنا ہوگا کہ تم کو یک جہاں نے کیا کہا

قائم اس کوچے سے شب غمگیں نہ آتا تھا یوں نہیں
کیا کہوں تجھ سے کہ اس کو پاسباں نے کیا کہا

○

نخل بے بر ہے چمن میں وہ شخص
جس سے کچھ خیر کا نہ کام ہوا

چپ سی کچھ لگ گئی اسے جو کوئی
تجھ سے یک بار ہمکلام ہوا

ظلم تھا خاص از پے عاشق سو بھی تجھ عہد بیچ عام ہوا
کل کسی شب اس طرح کٹی قائمؔ آج کا روز پھیر شام ہوا

اپنی ہی خوشی کے یہ سب الجھاؤ ہیں ورنہ اس راہ میں ہم نے تو کہیں دام نہ پایا
وہ نخلِ خزاں دیدہ ہوں اس دشت میں جسکے سائے میں کسی پنچھی نے بسرام نہ پایا
فہرست میں خوبانِ وفادار کی پیارے دیکھا تو کہیں اُس میں ترا نام نہ پایا

قائمؔ ترے سخن کو شوخی میں مانتا ہے ظاہر میں تجھ سے ناخوش گو ہے ہزار سودا

سُنیے کس کا سخن کہ دل سے مٹے داغ مرزا رفیع سودا کا

قائمؔ میں ریختہ کو دیا خلعت قبول ورنہ یہ پیشِ اہلِ ہنر کیا کمال تھا

سلوک عشق کوئی ہر کسی سے ہووے ہے بھلا ہر ایک گام میں مرنا ہے اک قدم جینا

کشاکش موج سے کرتا کوئی، مقدور تھا جس کا
میں اور تیری رضا پیارے، جدھر چاہے اُدھر لے جا

تو دل کو ڈھونڈھے ہے سینہ میں اب تلک اے غم کبھی کا خون ہو آنکھوں سے گر گیا ہوگا

گلی ہے، اس کی جو قائم کو لائے ہم تو کیا — یہ دل پہ نقش ہے اب تک کہ پھر گیا ہوگا

○

معاملہ ہو یہ دل کا اسے کہے گا وہ کیا — پیامبر کے ہمیں ساتھ آپ جانا تھا
یہ سچ کہ جھوٹ ہے دعویٰ دوستی لیکن — کبھو ہمیں بھی تو یک بار آزمانا تھا

○

بہتر ہے کہیے یار سے رخصت ہو اب تو دل — باقی جو زندگی ہے تو پھر آن دیکھنا
قائم قدم سنبھال کے رکھ کوئے عشق میں — یہ راہ بے طرح ہے مری جان دیکھنا

○

وہ گریہ آہ جو تھا موج زن گریباں تک — سو آج دامن مژگاں بھی اس سے نم نہ ہوا
ہے شیخ اگرچہ ترا کعبہ دیر میں مطبوع — پہ حیف ایسی جگہ میں کوئی صنم نہ ہوا
نہ جانے چشم سے کس کی گراہوں میں قائم — کہ جس جگہ پہ گیا پھیر محترم نہ ہوا

○

بناوے کوئی عمارت تو کس توقع پر — پڑا ہے قصر فریدوں، بن آدمی سُونا

○

نیک و بد جو تجھے کرنا ہے سو کر لے قائم — پھر امید نہیں یہ کہ جواں ہووے گا

○

دریا ہی پھر تو نام ہے ہر یک حباب کا — اٹھ جائے گر یہ بیچ سے پردہ حجاب کا
کیوں چھوڑتے ہو درد تہ جام مے کشو — ذرہ ہے یہ بھی آخر اسی آفتاب کا
اس دشت پر سراب میں بھٹکے بہت پہ حیف — دیکھا تو دو قدم پہ ٹھکانہ تھا آب کا

وہی معنی ہیں گو دھوکا ہے صورت کے ازالہ کا — اگر ژالہ ہو پانی سے، وگر پانی ہو ژالہ کا
بہت سا غور کو مت دخل دے نسخہ میں عالم کے — کہ حاصل دور ہے نظروں سے تیرے اس رسالہ کا

○

کہاں ہے دیدۂ گریاں کہ اب بقیہ عمر — کریں علاج ہم اس اپنی روسیاہی کا
فلک جو دے تو خدائی بھی لے نہ اب قائمؔ — وہ دن گئے کہ ارادہ تھا پادشاہی کا

○

شورِ محشر سے ہے پروا مجھے کیا اے واعظ — جبکہ ہمراہ لیے دل سا خلل جاؤں گا
ع آگے سودا کے میں لے کر یہ غزل جاؤں گا

○

ٹک بچیو صبا کہ ہر قدم پر — اس کوچہ میں ہے غبار میرا
قائمؔ ہوں اگرچہ ہیچ لیکن — کیا کیا کچھ ہے اعتبار میرا

○

جوں نگیں کس قدر ہیں طالب نام — روسیہ ہو ان اہلِ دنیا کا

○

رات، قائمؔ، تو اس مزاج پہ ہاں — سخت بے اختیار تھا، کیا تھا؟

○

بے دماغی سے نہ اس تک دلِ رنجور گیا — مرتبہ عشق کا یہاں حسن سے بھی دور گیا
کان تک یار کے، قائمؔ مرے اس عالم سے — رفتہ رفتہ جو گزر جلنے کا مذکور گیا
سن کے اتنا تو کہا حیف کہ اب دنیا سے — ناز برداریٔ معشوق کا دستور گیا

نہیں کہتا میں، دل خوباں سے مطلق ترک کر صحبت
پر اس فرقے سے کم ملنا تو تا مقدور بہتر تھا
ہر اک سے راز دل کہہ کر تو یہاں رسوا ہوا قائمؔ
بھلا اے بے خبر یہ بھی کوئی مذکور بہتر تھا

کب یہ کہتا ہوں کہ تیرا میں گنہگار نہ تھا
لیکن اتنی تو عقوبت کا سزاوار نہ تھا
لے گیا خاک میں ہمراہ دل اپنا قائمؔ
شاید اس جنس کا یہاں کوئی خریدار نہ تھا

عوض طرب کے، گزشتوں کا ہم نے غم کھینچا
شراب اوروں نے پی، اور خمار ہم کھینچا
خلش تھی مدّ نظر ہم سے، حرف گیروں کو
سو ہم نے ہاتھ ہی لکھنے سے یک قلم کھینچا

کیوں ہمنشیں! وہ دن بھی عجب دن تھے جن دنوں
اس سنگ دل کے دل میں مرے دل کو راہ تھا
جیتا ہی ہو خدا کرے قائمؔ، پہ تجھ بغیر
احوال اس جواں کا نہایت تباہ تھا

نامہ بر مل رہا ہے غیر کے ساتھ
خط میں کچھ اصطلاح کیجے گا
صبح کا کام شام پر تو رکھا
شام بولا صباح کیجے گا
گر یہی ڈول ہیں تو کب قائمؔ
ساز و برگ فلاح کیجے گا

درد دل کچھ کہا نہیں جاتا	آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا
مانع گریہ کسی کی خو ہے آج	آنسوؤں سے بہا نہیں جاتا
گرچہ قائمؔ اسیر دام ہوں لیک	مجھ سے یہ چہچہا نہیں جاتا

○

نباہ گو ہے توکل سے ایک کا ہی محال	چہ جاکہ ساتھ تو قائمؔ اک ازدحام لیا

○

نے وعدہ اس کے تھا، نہ پیغام کیا کہوں	پوچھے کوئی سبب جو مرے انتظار کا
قائمؔ جو کچھ کہ ہوگی سمجھ لیجو بعد مرگ	اب جیتے جی تو دیدار اُڑا، اُس دیار کا

○

بھلا ہوا کہ میں فارغ ہوں دین و مذہب سے	کسے دماغ تھا، اک ور دردِ سر ہوتا

○

ہے جوں حباب دو کے دم کی زیستہ کوئی	کہے یہ بات کہ خالی رہا ایاغ مرا

○

پہلے ہی گڈھا ملے جہاں شیخ	اُس کعبے کو ہے سلام اپنا

○

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر	روٹھا تھا آپ ہی تجھ سے میں اور آپ ہی من گیا
اے گردشِ زمانہ تری کجروی کے بیچ	یکسر نواحِ ہند سے شعر و سخن گیا
سودا تو اپنے حال میں مدت سے مست تھے	قائمؔ رہا تھا ایک، سو اپنے وطن گیا

○

میں عشق میں بتاں کے دل و دیں تو کھو چکا　　ناصح تو کیوں بکے ہے جو ہونا تھا ہو چکا
قائم ضرور کیا ہے اب اس جنگجو سے صلح　　مدت ہوئی کہ جاں سے میں ہاتھ دھو چکا

○

قائم کو اس طرح سے تو دیتا ہے گالیاں　　جس کو کسی نے آج تلک تو نہیں کہا

○

رکھیں اپنے تئیں ہم کس طرح دوست　　ہو تجھ سا شخص جب دشمن ہمارا
ہوس سے ہم کیا تھا عشق اول　　وہی آخر کو ٹھیرا فن ہمارا

○

بتاں نہ سمجھو کہ قائم ہے دیر کا پابند　　تماشہ بین ہے یہ رند اک خدائی کا

○

نکلی اُدھر زباں سے اِدھر جی نکل گیا　　کیا جانے کیا بلا تھی کچھ آوازِ عندلیب
پابندیٔ وفا ہے سب اے گل وگرنہ خیر　　باندھے ہیں کن نے یہاں پر پروازِ عندلیب

○

کیا وہ بت عشق کے قابل تھا ہمارے قائم　　کھینچ پر ــــ کیا کہ میاں یہ بھی خدا کے اسباب

○

خاک ہے اس مہر گردوں پر کہ یوں مٹی کے بیچ　　صورتیں کیا کیا دبیں اتنی خرّم و شاداب داب

○

رات کو چین ہے نہ دن کو تاب　　دل ہے یارب کہ پارۂ سیماب
جائے بود ن نہیں یہ بحرِ جہاں　　خانہ بردوش رہ تو مثلِ حباب

ہم دوانوں کو بس ہے پوشش سے — دامنِ دشت و چادرِ مہتاب
دل کے تابع ہیں جو ہوا سو کیا — ہم سمجھتے نہیں عذاب و ثواب
اب کہاں ہیں کدھر ہے اے ناصح — یہ بھی تھا مقتضائے عہدِ شباب
دل گنوانا تھا اس طرح قائمؔ — کیا کیا تو نے ہائے خانہ خراب

○

ہو، گر ایسے ہی، مری شکل سے بیزار بہت — تم سلامت رہو، بندے کے خریدار بہت
ہم دگر جب خفگی آئی سو جھگڑا کیا ہے — تم کو خواہندہ بہت، ہم کو طرحدار بہت
آج کے رونے میں جی ڈوب چلا تھا لیکن — نالۂ دل نے رکھا مجھ کو خبردار بہت
قائمؔ آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری — مر چکے ہیں اسی آزار کے بیمار بہت

○

تا چند سخن سازیِ نیرنگِ خرابات — یہاں قصدِ خرابی ہے نہ آہنگِ خرابات
دیکھیں تو تری دھوم ٹک اے شورشِ گیتی — پھر آج سرِ سینہ ہے اور سنگِ خرابات
کس نام سے قائمؔ میں تجھے کہہ کے پکاروں — اے عارِ درِ مسجد و اے ننگِ خرابات

○

جو تھی اس شمارِ زلف میں صرف — زیست کے ہے وہ کب حساب میں رات
رکھ لیا ضبطِ گریہ تیں ورنہ — میں تو بہہ ہی چلا تھا آب میں رات

○

چاہے ہیں یہ ہم بھی کہ رہے پاک محبت — پھر یہ بھی نہ ہو جس میں، وہ کیا خاک محبت
قائمؔ ہوں میں اس باغ کا بلبل کہ جہاں یاں — بے رتبہ ہے مثلِ خس و خاشاک محبت

شعلہ ہو دل سے گزرا آخر شرار الفت
باقی ہیں داغ کتنے اب یادگار الفت

○

نہ جرم اس کا ہے ثابت نہ کچھ مری تقصیر
خدا ہی جانے کہ رنجش کا کیا ہوا باعث
رہا میں اس سے گرفتہ اک عمر تک لیکن
کیا جو خوب تامل تو کچھ نہ تھا باعث

○

آج سمجھے کہ تھی سب سعی دل زار عبث
اتنی مدت ہوئے ہم غم میں ترے خوار عبث

○

قادرا! جب تلک قویٰ تھے درست
صاحبا جب تلک صحیح تھا مزاج
نہ کسو در پہ لے گیا تو مجھے
اہل دنیا کا جس طرح ہے رواج
نہ لوایا کسی سے باج مجھے
نہ دلایا کسی کو مجھ سے خراج
گھر ہی بستے دیا تو نے منت
تھا مرا جس قدر کہ مایحتاج
اب کہ ہیں جگ سے آسماں کے حواس
منتشر مثل پنبۂ حلاج
ضعف سے گھر کے آستانہ کو
پار ہونا ہے اک بڑی معراج
ایسے احوال میں کرے ہے مجھے
کس در و داربان کا محتاج؟

○

چاہے ہے اگر گل کو مری نشو و نما ہو
دل کھول کے دانے کی طرح خاک میں رُل آج
قائم یہ غضب کل تو نہ ٹوٹے تھا ترے پر
دیکھا ہے کہیں (کیا) وہ بت مہر گسل آج

○

نظریں بھرے ہیں سب کی اسے دیکھ کر آہ
یاروں کا فکر کیجے کہ اغیار کا علاج

قائم لگے ہیں یار رنگ ہوا غبار کے ساتھ — بہتر تو ہے جو کیجیے دو چار کا علاج

تکلیف نالہ کر نہ مجھے، آہ خدا کو مان — کیا جانے کیا غضب ہوا ابھی اک دم کے بیچ

ناصحا پوچھ نہ احوالِ خموشی مجھ سے — ہے یہ وہ بات کہ آتی نہیں تقریر کے بیچ
دیر آنا بھی ہے اک لطف، نہ اتنا تک ظالم — جی ہی جاتا رہے اک شخص کی تاخیر کے بیچ

بیکسی اپنی کس کو سونپ مروں — میں تو رکھا تھا اس کی جان کی طرح

مدتوں خدمت کی مسجد کی، بس اب کچھ تک دے لا — آ کوئی دم یہ بھی دیکھیں، کیا ہے میخانے کی طرح
کس کو دی قائمؔ فلک نے مفت یاں نشو و نما — خاک سے جب تک نہ یکساں کر لیا دانے کی طرح

یوں تو دنیا میں ہر اک کام کے استاد ہیں شیخ — پر جو کچھ آپ میں فن ہیں وہ کسے یاد ہیں شیخ
سب ہی بندے تو خدا کے ہیں پہ اتنا ہے فرق — تو گرفتار تعین ہے ہم آزاد ہیں شیخ
تھوڑی سی بات میں قائمؔ کی تو ہوتا ہے خفا — کچھ حرم زدگیں اپنی بھی تجھے یاد ہیں شیخ

خدا ہی خیر کرے، بات بے طرح ہے کچھ آج — کہ وہ پکار پہ ہے اور پیامبر گستاخ
ادب سے آدمی آنکھوں میں خوب لگتا ہے — مگر یہ فرقۂ خوباں ہو جس قدر گستاخ
بتاں کے خوف سے قائمؔ خلل ہے حرمت میں — خدا کے واسطے اس قوم کو نہ کر گستاخ

دل کی بے چینی سے یہ نقش ہے جی پر کہ کہیں / آ گئی پھر کسی کافر کی کوئی آن پسند
آہ کیا پیشہ کریں ہم کہ بجز مہرِ بتاں / اپنے جی کو تو نہ آیا کوئی عنوان پسند
وائے اس دل پہ کہ اسباب طلب ہے مطلق / آہ اس سر سے کہ اصلا نہیں سامان پسند
گو کہ قائمؔ یہ کہے، فردوں میں شعر کے بیچ / پر سخن چاہیے ایسا کہ ہو دیوان پسند

○

آہ اے پیرِ چرخ قائمؔ نام / یاں جو رہتا تھا اک جواں، ہے یاد؟

○

وعدہ جو کل کا آج پہ تھا سو ہوا خلاف / پھر آج آپ کہتے ہیں کل، یک نہ شد دو شد

○

کچھ آج دل پہ یہ وحشت کا رنگ ہے صیاد / ترے قفس سے چمن مجھ پہ تنگ ہے صیاد
ہوا ہے تارِ نفس رشتۂ پرِ پرواز / ہمیں تو زندگی قیدِ فرنگ ہے صیاد
قفس میں تنگ نہیں میں ہی صرف اے قائمؔ / مرے بھی نالہ و افغاں سے تنگ ہے صیاد

○

کرے تو پرچۂ خط سے ہمیں تو یاد، ولیک / ترے دیار میں کیدھر قلم، کہاں کا غذا

○

گفتگو صاف عجب لطف رکھے ہے قائمؔ / گرچہ ہیں شعر کے، واقع میں سب اقسام لذیذ

○

میں کیا کیا تھا ترا اے سپہرِ کج رفتار / کہ یاں تلک تو ہوا میرے درپئے آزار
جو چند کس تھے موافق مری طبیعت کے / بہ ہر نمط مجھے کٹتے تھے ان میں لیل و نہار

ہو بیٹھتے تھے مصیبت طلب، کئی یکجا — اکٹھے ہوئے تھے کتنے اک، عاقبت بیزار
اگرچہ ہاتھ سے تیرے ہر ایک نالاں تھا — پہ دردِ دل کا نہ کرتے تھے یک دگر اظہار
بہر طریق مرا وقت خوش گزرتا تھا — بھلے بُرے سے زمانے کے کچھ نہ تھا سروکار
لے آیا واں سے مجھے اب تو اس مصیبت میں — کہ یاں نہ مونس و ہمدم، نہ یار و نے اغیار
خوشا وہ عہد کہ روتا ہوں یاد میں جس کی — زہے وہ وقت کہ جس کا ہے درمیاں تکرار
—اور اب تو غم سے میں اس مرتبہ مکدّر ہوں — کہ ہے مجال خموشی نہ طاقتِ گفتار

○

غریب زار ہے وہ شخص جو پلے ہے بھونرے کو
کہ قوت باز کو دنیا، ستم کرنا ہے لک لک پر
وہی کچھ قدر سمجھے گا، مری فرسودہ پائی کی
طپش سے گھس گئے جس مرغ کے آپس میں لگ لگ پر

○

مت قصر کو ہستی کے کھڑا دیکھ، کہ غافل — مانند حباب اس کی ہے تعمیر ہوا پر
پوچھیں گے سلیمان سے کیدھر گیا برباد — وہ تخت جو چلتا تھا بہ توقیر ہوا پر

○

سالکِ عشق کو لازم ہے کرے ترکِ قیود — جو شناور ہے اگر ہو وہ برہنہ بہتر

○

بے شغل نہ زندگی بسر کر — گر اشک نہیں تو آہ سر کر
کچھ طرفہ مرض ہے زندگی بھی — اس سے جو کوئی جیا سو مر کر

کعبہ کے سفر میں کیا ہے زاہد — بن جائے تو آپ سے سفر کر
یہ دہر ہے کارگاہِ مینا — جو پانوں رکھے تو یہاں سو ڈر کر
فرصت ہے غنیمت، آج، عاقل — جو ہو سکے، نفع یا ضرر، کر
تعمیر پہ گھر کی جا نہ اے دل — قائمؔ کی طرح دلوں میں گھر کر

○

تھی تو اک بات، پہ کیا کہیے، کہ یہاں تو پیارے — نکلی ہی پڑتی ہے تلوار کمر سے باہر
بہتے دیکھا نہیں یاروں نے لہو کا سیلاب — رکھ ٹک اے اشک قدم دیدۂ تر سے باہر
ایک سودا کی تو قائمؔ نہ کہوں میں، ورنہ — ہے تما طورِ سخن حدِ بشر سے باہر

○

بھلا اے ابرِ مژگاں ٹک تو بس کر — ابھی تو کھل گیا تھا تیں برس کر
بہارِ عمر ہے قائمؔ کوئی دن — اُسے جوں گل پیارے کاٹ ہنس کر

○

حرفِ کفر و دیں پہ ہے کیا منحصر — ہاں دلا، خُذ مَا صَفَا دَعْ مَا کَدَر

○

ناصحا ترک کیجیے کس کس کا — جیتے جی کو تو سب کچھ ہے درکار
ہم نے دیکھا ہے داغ دل قائمؔ — وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار

○

واقف نہیں ہم کہ کیا ہے بہتر — جز یہ کہ تری رضا ہے بہتر
قائمؔ جو کہے ہیں فارسی یار — اس سے تو یہ ریختہ ہے بہتر

○

تھی وفا اس مرتبہ یا بیوفائی اس قدر
آشنائی اُس قدر نا آشنائی اِس قدر

دست تہی ہے مانعِ دیدارِ دوستاں
یا جائے ایسی آن سے احباب کے حضور
مانوں گا شاعری کو میں قائم تبھی تری
سرسبز یہ غزل ہو جو نواب کے حضور

روتے گئے گلی سے تری بسکہ اہلِ دل
ہے ان کی فیضِ چشم سے ہر خارِ راہ سبز

عالم سے حیف جس کے لیے کی میں دشمنی
کرتا ہے دوستی کو مری امتحاں ہنوز
جو وقت پر اٹھے تھے سو منزل پہنچ چکے
ویسا ہی خواب میں ہے مرا کارواں ہنوز

میں بعد مرگ بھی قائم چھٹا نہ گردش سے
ہے میری خاک سے اس بزم میں ایاغ ہنوز

نے کلہ کا جی میں یہاں خطرہ، نہ افسر کی ہوس
دین و دنیا سے کچھ ادھر ہے قلندر کی ہوس

قائم وہ عمل کر بعد تیرے
یک خلق کہے کہ ہائے افسوس

کیوں تو صیاد کیا ہم کو گرفتارِ قفس
ہم نہ شائستۂ بسمل، نہ سزاوارِ قفس

سینہ کاوی ہے کام ہی کچھ اور
کوہ کن لو ہے مرد سنگ تراش

جو سوزِ عشق کا چرچا وہاں نہیں قائمؔ　　تو کیا میں جاؤں گا دینے بہشت میں آتش

گستاخ نہ ہو خاک نشینوں سے کہ قائمؔ　　دیکھی ہے چھپی راکھ میں ہم پیشترِ آتش

سجدہ ہو آستانِ حرم کا نصیبِ شیخ　　میں اور سرِ نیاز و درِ پیرِ مے فروش

اس کو نہ راست کہہ نہ تو اس کو بتا غلط　　کیا جانے کیا صحیح ہے کیا جانے کیا غلط

کیا ہے وضعِ جہاں نے تو دل کو بس محظوظ　　کہ لاکھ جی سے ہیں عاجز اگر ہیں دس محظوظ
ہمیشہ دستِ تاسف ملے ہے وہ جس کو　　کرے ہے چاشنیِ دہر جوں مگس محظوظ

یوں جلے آہ پتنگے سا تماشائیِ شمع　　آگ لگیو تجھے اے انجمن آرائیِ شمع
رازِ دل سوختگاں کیونکہ چھپائے سے چھپے　　ہوتی ہے پردۂ فانوس میں رسوائیِ شمع
فکرِ بے تابیِ پروانہ کرے کون مختزع　　آپ ہی عشق میں ہے پنجہ گیرائیِ شمع

سرفروشی کے مختزع ہم ہیں　　گو اب دیکھی دو کاں رکھے ہے شمع
راتوں جاگی ہے مثل قائمؔ کے　　تب یہ سوزِ بیاں رکھے ہے شمع

نام سنتے ہی اس کا لیں قائمؔ　　پھر کیا تو نے اضطراب شروع

قائم ہو کوئی لطف سے صحبت کے کب آگاہ / جوں شمع جو کچھ عمر کٹی یاں سو تہِ تیغ

○

اس چمن میں دیکھیے کیوں کر بسر ہووے نسیم / ہے مزاجِ نکہتِ گل شوخ اور ہم بے دماغ

○

آج آپ مرے حال پہ کرتے ہیں تاسف / اشفاق! عنایات! کرم! مہر! تلطف!
صوفی ہے وہ، بے علم ہو ہستی سے جو اپنی / کس کام پڑھا تو نے اگر علمِ تصوّف
خاموشی بھی کچھ طرفہ لطیفہ ہے کہ قائم / کرنا پڑے جس میں نہ تصنّع نہ تکلف

○

کس بات پر کروں میں تری اعتبار ہائے / اقرار یک طرف ہے، تو انکار یک طرف

○

قائم تو جی لگا کے نہ لکھیو یہ ریختہ / ہونا پڑے گا حضرتِ استاد کی طرف

○

پاسِ اخلاص سخت ہے تکلیف / تا کجا خاطرِ وضیع و شریف
کیوں نہ واہی ہو شعر قائم کا / ہے دوانے کی آخرش تصنیف

○

قاتل کی طرف سے ہو نہ دعویٰ / بس ہے یہی خوں بہائے عاشق

○

ایکی اگر بخیر ہے انجامِ اشتیاق / کہیے گا سب مصائب و آلامِ اشتیاق
ہر صبحِ انتظار کا دیجے گا اس کو عرض / کیجے گا ذکر حالتِ ہر شامِ اشتیاق

کہیے گا یاد کر کے ہر اک دن کی سرگزشت — جن جن دکھوں سے کاٹے ہیں ایام اشتیاق

اے راست وعدہ شام سے تجھ بن سحر تلک — سو بار پھر گیا ہوں میں آپ کے در تلک
قائم میں اختیار کیا شاعری کا عیب — پہنچا نہ کوئی شخص جب اپنے ہنر تلک

دل دے کے دیا میں تجھ کو جاں تک — کوئی اور جگر کرے کہاں تک
آمادۂ سوختن ہوں یک بار — اے برق مرے بھی آشیاں تک!
صحبت کے مزے ہوں یوں برافتاد — اک بات ہے ناز، پر نہاں تک!؟
ہاں نالہ، کہ ہے یہ وقت امداد — پہنچی تو ہے آہ آسماں تک
قائم جو ہے شمع بزم معنے — میں رات گیا تھا اس جواں تک
پایا تو ہے ڈھیر آنسوؤں کا — دیکھا تو گداز استخواں تک

مجھ بے گنہ کے قتل کا آہنگ کب تلک — آ اب بنائے صلح رکھیں جنگ کب تلک
پیارے نہیں یہ وقت ترا مقتضیٔ ناز — بس درگزر اب اس سے کہ یہ ڈھنگ کب تلک
چہرے پہ اشک سرخ سے ہیں صد طراز خوں — دیکھے رہے ہے گریے کا یہ رنگ کب تلک

آئی اگر بہار تو کیا فائدہ کہ یہاں — ناساز ہے مزاج سے اپنے ہوائے گل
نالوں سے عندلیب کے آیا ہے جی بتنگ — کس نے مرے مزار پہ آکر چڑھائے گل
آوارہ کر چمن میں مرے بال و پر نسیم — آئندہ تا نہ ہووے کوئی مبتلائے گل

قائم وطن کے بیچ تو آسودگی نہ ڈھونڈھ
پُرخار گلستاں میں ہمیشہ میں پائے گُل

توڑنا دیر و حرم تک بھی نہ چنداں ہے گناہ
اپنے مذہب میں ہے کچھ کفر تو آزردنِ دل
شب میں قائم مجھے اس بزم سے جاتے دیکھا
یوں ہی کہیں ہوئے ہے بیدرد، بُردنِ دل

زہرابِ ہلاہل سے جو کچھ کام نہ نکلا
دے کر کئے ہیں کی خونِ جگر، پرورشِ دل

مسجد میں خدا کو بھی نہ کیجے سجدہ
محراب جو خم ہو نہ، برائے تعظیم

اب کی جو یہاں سے جائیں گے ہم
پھر یہ بھی سہی نہ آئیں گے ہم
جو آگے کہا کیے ہیں تجھ سے
سو ابکی وہ کر دکھائیں گے ہم
جینے ہی سے ہاتھ اٹھائیں گے لیک
باتیں نہ تری اٹھائیں گے ہم
گر زیست ہے تجھ تلک تو پھر کیا
صدقے ترے مر ہی جائیں گے ہم
اب کوچے میں تیرے ہی پیارے
کسی اور سے جی لگائیں گے ہم
جوں چاہیے پیار کا سر رشتہ
جیتے ہیں تو کر دکھائیں گے ہم

وہ بُت کہ شیخ جسے تو الٰہ کہتا ہے
جو مغز بات کا سمجھے، اسی کا ہے سرنام
لبطور ہزل ہے قائم یہ گفتگو ورنہ
تلاش ہے یہ مجھے ہو نہ شعر میں ایہام

جب موج پہ اپنی آگئیں چشم — دریا دریا بہا گئیں چشم
بندہ ہوں میں اس ادا کا قائم — دیکھا کہ وہیں لجا گئیں چشم

شیریں سا بھی اگر ہو کوئی قدرداں تو آج — ناخن سے چیر ڈالیں کئی کوہسار ہم

دامِ زر کا مت بچھا قائم کی وحشت کے لیے — اہلِ عزّت کو کرے ہے پیشتر اکرام رام

جوں شمع جلتے مرتے ہی گزری تمام عمر — رکھتا ہے کوئی ایسے بھی شام و سحر، کہ ہم
قائم نہ میں کہا تھا کہ مت پی شرابِ عشق — کھینچے ہے اب خمار سے تمیں دردِ سر، کہ ہم

قائم نہ کہتے تھے کہ نہ مل ان بتاں سے گرم — اب سنگِ آستاں سے تو مارے ہے سر کہ ہم

میں رہ گزر میں پڑا ہوں برنگِ نقشِ قدم — تئیں چھوڑا کس کے بھروسے پہ کارواں مجھ کو

میرا سا لب و لہجہ کہاں مرغِ چمن میں — گل کتروں ہوں سو رنگ سے میں طرزِ سخن میں
غربت میں مرا حال جو تو دیکھے ہے قاصد — زنہار نہ کہیو اسے یارانِ وطن میں

اس کم سے نگہِ شوق لپٹتی تو ہے لیک — جی یہ دھڑکے ہے کہ الزام نہ آجائے کہیں
عذرِ تقصیر ہی چاہوں گا میں اس سے اے دل — ٹک تو خاموش ہو دینے سے وہ دشنام کہیں

نے جرم فلک کا ہے نہ کچھ بخت کی تقصیر
خود رائی سے ہم اپنی سدا خوار رہے ہیں

بیداری شب، شیخ ہمارے کی ہے مسلّم
پر جانیے کس کام میں بیدار رہے ہیں

پوچھ ہم سے تو احوال خرابات کہ قائم
یک عمر ہم اس گھر میں بھی مختار رہے ہیں

گل کا بھی تجھ سے کم تو میاں رنگ و بو نہیں
پر گل کو کیا میں آگ دوں لیکر، جو بو نہیں

وضع دوراں کو خوشامد وستے قائم تو ہو
ہر کس و ناکس سے دب چلنا، یہ اپنی خو نہیں

آہ وہ یار کہاں ہیں جو ہمیشہ قائم
تا نہ رکھتے تھے مرے عیش کے اسباب کے تئیں

قائم اس باغ میں بلبل تو بہت ہیں لیکن
دل کھلے نالے سے جس کے، وہ ہم آواز کہاں

کون چاہے ہے بتاں تم سے مدارا کے تئیں
پر تنک نرم کرو اس دل خارا کے تئیں

دین داری کا ہوں میں شیخ کی بندہ جس نے
دی جلا کفر یہودی و نصاریٰ کے تئیں

جو کوئی در پہ ترے بیٹھے ہیں
دونوں عالم سے پھرے بیٹھے ہیں

کوئی آیا ہی نہ بھولا ہم تو!
کب سے رستے کے سرے بیٹھے ہیں

کل اے آشوبِ نالہ، آج نہیں — آج ہنگامے پر مزاج نہیں
غیر اس کے کہ خوب روئیے، اور — غمِ دل کا کوئی علاج نہیں
اب بھی قیمت ہے دل کی گوشۂ چشم — اتنی یہ جنس بے رواج نہیں

○

گو سبک مجھ کو زمانے نے کیا ہے لیکن — یہ بھی ہے شکر، کسی دل کا تو میں بار نہیں
مجلسِ مے سے مشابہ ہے خراباتِ جہاں — جان کر یہاں جو نہ ہو مست سو ہشیار نہیں
ہر بد و نیک جہاں اپنی جگہ ہے مطلوب — کونسا عضو بدن میں ہے کہ درکار نہیں
مے کی توبہ کو تو مدت ہوئی قائم لیکن — بے طلب اب بھی جو مل جائے تو انکار نہیں

○

تا کجا مستی میں ناخوش دلِ احباب کریں — یک دو جام اور بھی ساقی کہ بس اب خواب کریں

○

فارقِ نیک و بدِ دہر ہے تیرا پندار — ورنہ کچھ فرق نہیں سینہ و آئینہ میں
صورتِ غیر کو قائم نہ جگہ دے دل میں — عکس جاتا ہی نہیں آ کے اس آئینہ میں

○

نہ بیم غم ہے نہ شادی کی ہم امید کرتے ہیں — قلندر ہیں جو پیش آ جائے سب کچھ دید کرتے ہیں
یہ کاسا سر تلے رکھے جو میخانوں میں سوتے ہیں — جسے چاہیں اسے اک جام میں جمشید کرتے ہیں

○

موافقت کی بہت شہریوں سے میں لیکن — وہی غزال ابھی رم رہا ہے آنکھوں میں
نہ دل بھرا ہے نہ اب نم رہا ہے آنکھوں میں — کبھو جو روئے تھے خوں جم رہا ہے آنکھوں میں

بسانِ اشک ہے قائم تو جب سے آوارہ　　وقار تب سے ترا کم رہا ہے آنکھوں میں

پر نہ کہہ بات کو تئیں حضرتِ قائم کی کہ وہ　　مست اللہ (کے) ہیں کیا جانیے کیا کہتے ہیں

یہ جانتا میں نہیں ہوں کہ دل ہے کیا قائم　　پر اک خلش سی رہے ہے مدام سینے میں

کر زیست اس طرح سے جہاں میں کہ بعد مرگ
نفریں کوئی کہے نہ، اگر آفریں نہیں

کون سا دن کہ مجھے اس سے ملاقات نہیں　　لیک دل چاہے ہے جوں ملنے کو وہ بات نہیں
رونقِ بادہ پرستی تھی بہت جب سے ٹک　　ہم نے کی توبہ کہیں نام خرابات نہیں

ہوس ہو عشق کی اہلِ وفا کو ہم تو میاں　　سُنے سے نام محبت کا زرد ہوتے ہیں

گریباں کی تو قائم مدتوں دھجیئں اڑائی ہیں
یہ خاطر جمع اس دن ہوئے جب سینے کو ہم چیریں

ظالم تو یہ نہ جان کہ تجھ سے خفا ہوں میں　　ویسا ہی جاں نثار، وہی آشنا ہوں میں
آگے مرے، نہ غیر سے جو تم نے بات کی　　سرکار کی تو نظروں کو پہچانتا ہوں میں

پوچھو گے مجھسے تم کہ پیے گا بھی تو شراب — ایسا کہاں کا شیخ ہوں یا پارسا ہوں میں

وائے اس دل پہ جو بے چین شب و روز نہیں — آہ اس سینے سے، جس میں کہ ترا سوز نہیں
خدمتِ دیر و حرم کی جو میں یک عمر تو کیا — در گہِ دل میں تو ابتک شرف اندوز نہیں
قائمؔ اور تجھسے طلب بوسے کی، کیونکر مانوں — یوں وہ ناداں ہے، پر اتنا تو بد آموز نہیں

خوش رہ اے دل اگر تو شاد نہیں — یہاں کی شادی پہ اعتماد نہیں
سچ ہیں سارے کمال حضرت شیخ — لیک دل کو کچھ اعتقاد نہیں

آپ جو کچھ قرار کرتے ہیں — کہیے ہم اعتبار کرتے ہیں
چلیے قائمؔ، کہ رفتگاں اپنا — دیر سے انتظار کرتے ہیں

قائم تو اس طرح جو پھرے ہے خراب و خوار — اے خانماں خراب، مگر تیرے گھر نہیں؟

قائم بہ فیضِ حضرتِ سودا ہے ورنہ میں — طرحی غزل سے میر کی آتا تھا بر کہیں

قائم اس کوچے میں پھرے ہے مگر — ابھی کچھ بات ٹھیک ٹھاک نہیں

مے پی جو چاہے آتشِ دوزخ سے تو نجات — جلتا نہیں وہ رخت جو تر ہو شراب میں

قائم ہو کس طرح سے بہم شکلِ اختلاط　　وہ اُس غرور و ناز میں ہم اس حجاب میں

○

یہ کہاں اور وہ گل کدھر قائم　　اک ہوا باندھے ہے صبا یوں نہیں

○

یہاں تک ترے میں شوق سے لبریز ہوں کہ شوخ　　آوے جواب تو آپ، تو تیری جگہ نہیں

○

میں اس اخفا سے تیری یاد میں دل شاد کرتا ہوں
کہ خود واقف نہیں اب تک میں کس کی یاد کرتا ہوں

○

ترکِ وفا اگرچہ صداقت نہیں　　پر یہ ستم سہنے کی طاقت نہیں
ترک کر اپنا بھی کہ اس راہ میں　　ہر کوئی شایاں رفاقت نہیں
نام ہی قائم کا گیا ہے نکل　　ورنہ کچھ اتنی تو لیاقت نہیں

○

وہ قوی رشتۂ الفت ہے کہ جس سے قائم　　بندھ کے چھوٹے نہ، اگر شیر کو زنجیر کریں

○

ٹکڑے کئی اک دل کے، میں آنسو میں پیے ہیں　　پھر صبح تلک رونے کے اسباب کیے ہیں
تیں ساتھ رقیبوں کے مے آشامیاں کیں رات　　یہاں زہر کے سے گھونٹ اک عالم نے پیے ہیں
اے شمع اسی جلنے پہ اپنے ہے تو نازاں　　دیکھ ہم کو یہاں داغ پہ ہم داغ لیے ہیں

○

کہتا ہے آئینہ کہ ہے تجھ سا ہی ایک اور — باور نہیں تو لا میں ترے رو برو کروں
قائم یہ جی میں ہے کہ تقید سے شیخ کے — اب کی جو میں نماز کروں بے وضو کروں

○

جس کو ہستی و عدم جانتے ہیں — ہے وہ کچھ اور ہی ہم جانتے ہیں
جزو و کل ایک ہے جوں قطرہ و بحر — بہت اس رمز کو کم جانتے ہیں

○

ضعف و بے طاقتی و خشکی سے شکوہ ہی کیا — عشق کہتے ہیں جسے، اسکے یہی عالم ہیں

○

تنت ہوں قائم خموش، کیا جانے — کس تہیدست کا چراغ ہوں میں

○

اپنا قصور سعی ہے ملتا جو وہ نہیں — کیونکر ملے وہ جس کی ہمیں جستجو نہیں

○

درد پی لیتے ہیں اور داغ بچا جاتے ہیں — یہاں بلا نوش ہیں جو آئے چڑھا جاتے ہیں

○

میں اپنے واسطے کہتا نہیں پیارے، پر عاشق کو
نہ اتنا تنگ کر جس کا مآل آخر ندامت ہو

○

ایک مدت سے میاں وہ تو موا پھرتا تھا — آج تم مرنے کا عاشق کے عجب کرتے ہو
قائم اک بات یہ جیتا ہے تمہاری لیکن — پرسشِ حال تم اس خستہ کی کب کرتے ہو

قبول عذر تو ہاں ہے جہاں ملال بھی ہو — یہ جانِ پاک صفا یہاں جو کچھ خیال بھی ہو
کمال جگ میں سزاوار ناز ہے یہ سچ — پہ ناز کرنے کو انساں میں کچھ کمال بھی ہو
قصور خدمت احباب اس قدر تا قائم — کچھ آدمی کو ہے لازم کہ انفعال بھی ہو

○

ہوا جو تجھ پہ قائم تھی سزا کردار کی تیرے — نہ کہتا تھا میں اُس بیگانہ خو سے آشنا مت ہو

○

جانے دو جو نصیب میں ہونا تھا سو ہوا — یا رو خدا کے واسطے تکرار مت کرو
قائم کہ رازِ عشق کا پردہ ہے اے بتاں — اک شخص ہے یہ اسکو نپٹ خوار مت کرو

○

قائم اسی قدر جو ضروری ہے عرضِ شوق — کر تو ہی قصد گو نہ ہوا نامہ بر، نہ ہو

○

دل نازک و کار عشق در پیش — اپنا ہے نپٹ ہراس مجھ کو
یارب گیا کون یہاں سے مہماں — لگتا ہے یہ گھر اداس مجھ کو
حیرت نے کیا ہے یک جہاں کا — جوں آئینہ روشناس مجھ کو

○

ہم موئے پھرتے ہیں اور خواہش جاں ہے اسکو — اب تلک بھی وہی جینے کا گماں ہے اسکو
اے دل افسردگی داغ ہے کیوں، تو بلبل — جو گل اس باغ میں آتا ہے خزاں ہے اسکو
قصۂ برہنہ پائی کو مرے لے مجنوں! — خار سے پوچھ کہ سب کی زباں ہے اسکو

○

ناصحا کر نہ اسے سعی کے پشیماں مجھ کو
کتنے ہی چاک ابھی کرنے ہیں گریباں مجھکو

اہل مسجد نے جو کافر مجھے سمجھا تو کہا
ساکنِ دیر تو جانے ہے مسلماں مجھکو

○

وہ دن گئے کہ اٹھاتے تھے نازِ نکہتِ گل
ہے بے دماغیٔ دل ان دنوں گراں مجھکو

تو تنے واسطے اے باغباں نہ کاوش کر
بہت ہے سایۂ دیوارِ گلستاں مجھکو

○

ٹک تو خاموش رکھو منہ میں زباں سنتے ہو
اپنی ہی کہتے ہو، میری بھی میاں سنتے ہو؟

سنگ کو آب کریں پل میں ہماری باتیں
لیکن افسوس یہی ہے کہ کہاں سنتے ہو

خشک و تر پھونکتی پھرتی ہے سدا آتشِ عشق
بچیو اس آنچ سے اے پیر و جواں سنتے ہو

دم قدم تک تھی ہمارے ہی جنوں کی رونق
اب بھی کوچوں میں کہیں شور و فغاں سنتے ہو؟

○

قائمؔ خدا کے واسطے بدمستیاں یہ چھوڑ
بدنام اس سے زیادہ نہ کر تُو شراب کو

○

نے ہجر چاہتا ہوں نہ وصلِ حبیب کو
یا رب کہیں ہو صبر دلِ ناشکیب کو

دے بھی تو آدمی ہیں کہ جن سے تمہیں ہے ربط
کیا شکوہ تم سے روئیے اپنے نصیب کو

کہتا ہے کون اپنے لیے چاہو سو کرو
لیکن بہت برا ہے ستانا غریب کو

○

یارو کیوں بکتے ہو، بے فائدہ مجھ سے جاؤ
اتنی کہتے ہو مجھے اتنی اُسے سمجھاؤ

○

شمع ساں جلنے کو صانع نے بنایا مجھ کو — جس کے ہی ہاتھ پڑا اُن نے جلایا مجھ کو

اک ہمیں خار تھے آنکھوں میں سبھوں کی چلے — بلبلو خوش ہو اب تم گل و گلزار کے ساتھ
میں دوانہ ہوں صدا کا مجھے مت قید کرو — جی نکل جائے گا زنجیر کی جھنکار کے ساتھ
یارو وہ کہتے تھے جو تم لالہ و گل ہے سو کہاں — سر پٹکنے تو نہ آیا تھا میں کہسار کے ساتھ
گرچہ بلبل ہوں میں قائم ولے اس باغ کے بیچ — فرق کوئی نہ کرے گل کو جہاں خار کے ساتھ

آتش عشق میں جلنا نہیں کار آساں — ہر مگس سے نہ طلب کر جگر پروانہ
شمع تک جاتے تو دیکھا تھا ہم اس کو قائم — پھر نہ معلوم ہوئی کچھ خبر پروانہ

کوندے ہے دل پہ برق سی آج — پیش نظر ہے کس کی نگاہ
قائم سے کیوں ہوئے خفا — بندہ، خادم، دولت خواہ

کیجے گا صلح پھر دل بے مدعا کے ساتھ — اک بن ہے کچھ قبول کرو اپنی دعا کے ساتھ
موتی صدف سے نکلے ہے قائم کب اس طرح — ڈھلتی ہے بات منھ سے ترے جس صفا کے ساتھ
قائم سمجھ کے بولیو نواب کے حضور — پیارے معاملت ہے سخن آشنا کے ساتھ

شیخ جیو آیا نہ مسجد میں وہ کافر ورنہ ہم — پوچھتے تم سے کہ اب وہ پارسائی کیا ہوئی

جوں موج مرا قافلہ غافل ہے سفر سے
کیا جانے کہاں جائے گا آیا ہے کدھر سے!

مانندِ نگیں چاہے اگر نام کو قائم
باہر نہ قدم رکھیو مری جان تو گھر سے

ہم سے کیا ناخوش، وفا قائم سے خوش
جو ہو میاں حصہ رسد چاہیے

سوائے دل شکنی سب مباح ہے یہاں شیخ
خبر نہیں تجھے رندوں کے دین و مذہب کی

گہ پیر شیخ گاہ مرید جواں رہے
اب تک تو آبرو سے نبھی ہم جہاں رہے

دنیا میں ہم رہے تو کئی دن پہ اس طرح
دشمن کے گھر میں جیسے کوئی میہماں رہے

مسجد سے گر تو شیخ نکالا ہمیں تو کیا
قائم وہ مے فروش کی اپنے دکاں رہے

قائم کو اپنی بزم سے جانے نہ دے کہ یار
کیا ہے برا کہ مفت میں اک شعر خواں رہے

قائم ترے کو اس سے ہزاروں ہے چشم داشت
یا رب ہو تا جہان، اسد یار خاں رہے

ہم نشیں ذکرِ یار کر کچھ آج
اس حکایت سے جی بہلتا ہے

آج قائم کے شعر ہم نے سنے
ہاں اک انداز تو نکلتا ہے

آؤ کچھ شغل کریں بیٹھے ہیں عریاں اتنے
پھاڑیں سینے ہی کو، ہاتھ آتے گریباں اتنے

تجھ کو قائم رکھے اللہ بہت سال اے امیر
مجتمع سائے میں جس کے ہیں سخنداں اتنے

کیا دلِ غمزدہ ہوگا تو جسے شاد کرے
یوں تری بندہ نوازی جو کبھو یاد کرے

قاصد تو گیا اس کی خبر لانے کو لیکن
دل دھڑکے ہے کیا جانیے کیسی خبر آوے

قائم تری سب عمر کٹی عشق بتاں میں
اے وائے وہ اوقات کہ جو عبث بسر آوے

کبھو کسو سے بھی کہتا تھا دردِ دل اپنے
پر اس طرح کہ شکایت ہے کچھ زمانے کی

خدا نکردہ اُسے غیر سے تو کیا سروکار
تھی ایک بات ہمارے ہی یہ جلانے کی

جب میں دیکھا ہے تو اس دل کو غمیں دیکھا ہے
یہ نیا چاؤ محبت کا نہیں دیکھا ہے

اک شناسائی ہمیں بھی تھی طرب سے قائمؔ ‎ ‎ لیکن ایسے کہ جیسے کہیں دیکھا ہے

مرا کوئی احوال کیا جانتا ہے ‎ ‎ جو گزرے ہے مجھ پر خدا جانتا ہے

جو بو کچھ اور بھری ہو دماغ میں گل کے ‎ ‎ کہوں کہ وہ ابھی لٹتے لے باغ میں گل کے

عجب مزا ہے چمن بیچ پر ہزار افسوس ‎ ‎ کہ صبح و شام ہے گلچیں سراغ میں گل کے

نہ دیکھ سرسری اوراق گل کو یہاں قائمؔ ‎ ‎ ہے شرح تنگی غنچہ فراغ میں گل کے

کوئی ٹک اُسکو حال کی میرے خبر کرے ‎ ‎ پر اس طرح کہ دل میں کچھ اُس کے اثر کرے

پہلے ہی سوچنی تھی ہمیں اے شبِ فراق ‎ ‎ یہ رات بے طرح ہے خدا ہی سحر کرے

کوسوں سے آدمی کو جو دیکھا تو کیا ہوا ‎ ‎ وہ چشم ہے جو حال پر اپنے نظر کرے

کیا جانیے یہ باتیں بھی سنتا ہوں کس لیے ‎ ‎ ایسا ہے ورنہ کوئی جو یوں نہ گذر کرے

کہتے ہیں لوگ گالیاں قائمؔ کو دے گیا ‎ ‎ اے کاش یہ سلوک وہ بارِ دگر کرے

آج ہے گریہ خبر لے مرے دیوانے کی ‎ ‎ کچھ رکا جاتا ہے دل گرد سے ویرانے کی

ہنوز شوق دل بے قرار باقی ہے ‎ ‎ بجھی ہے آگ تو لیکن شرار باقی ہے

گیا تھا آج میں قائمؔ کے دیکھنے کے لیے ‎ ‎ کوئی دم اور نفس کا شمار باقی ہے

ہمت مری ہوئی نہ کسی مرتبہ میں بند ‎ ‎ کیا جانے کس مقام کی تھی آرزو مجھے

کم ظرف یک دو ساغرِ مے سے کرے ہیں دھوم ‎ ‎ بھر دے نہ مثل شیشہ تو یہاں تا گلو مجھے

عشق کا داغ نہ کہہ کیونکے سہا جاتا ہے ‎ ‎ داغ جو دے ہے وہی یار جگر دیتا ہے

نقد ہستی کو پرکھنا نہیں آساں قائمؔ ‎ ‎ وہی سمجھے ہے خدا جس کو نظر دیتا ہے

یوں آدمی کہلاوے ہر گربہ و سگ لیکن ‎ ‎ جس سے کہ عبارت ہے انسان وہ عنقا ہے

کون ہے قائمؔ اس جگہ جسکو نہیں کسی سے ربط ‎ ‎ میری ہی چاہ کی فقط شہر میں دھوم پڑ گئی

لے سکے قائم سے جو کچھ لے چک اے خانہ خراب
وہ مسافر آج کل چلنے کی تیاری میں ہے

تو اپنی سی دل کی خو نہ سمجھے
یہ بگڑے تو پھر کبھو نہ سمجھے

بھلی خیر یہی کہ رات پیارے
تم غیر کی گفتگو نہ سمجھے

شایان چمن نہیں وہ بلبل
ہر گل کا جو رنگ و بو نہ سمجھے

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بہ زبانِ دکنی تھی

فقط شاعر نہیں ہم، بلکہ قائم
ہمارا ایک ادنیٰ یہ بھی فن ہے

گہ ہوئی صبح گاہ شام ہوئی
عمر انھیں قصوں میں تمام ہوئی

جوں شاخ گل، ہے فکر میں میری شکست کے
میرا اگر اس چمن میں روادار ہے کوئی

نہ غم برا ہے نہ عیش و نشاط بہتر ہے
سبھی مساوی ہیں یہاں، یہ فقیر کا گھر ہے

گناہ کرتے ہیں کس سے چھپا کے ہم اے دل
وہ آپ دیکھے ہے جس کا ہمیں بڑا ڈر ہے

بسر لے جایئے پیارے (یہ) کیونکہ تجھ سے بدخو سے
کہ تا رنجش، ہمیشہ ناخوشی، ہر لحظہ ناچاقی

شیخ جی گر امام ہو، میں بھی کروں کچھ التماس
آپ تو خاطر میں جو آیا سو فرماتے رہے

قائم میں عندلیب خوش آہنگ تھا حیف
زاغ و زغن کے ساتھ کیا ہم قفس مجھے

میں اور اُس بت کے دام میں پھنس جاؤں
یہ کسی کی خدا نہ مت کھو دے

پاک طینت ہے یہاں وہ، لے ساقی
جس کے دل کا غبار مے دھو دے

گر ہم سے تم ملے نہ، تو ہم بھی نہ مر گئے
کہنے کو رہ گیا سخن، اور دن گزر گئے

بھٹکا پھروں ہوں یہاں میں اکیلا ہر ایک سمت
اے ہمرہانِ پیشِ قدم تم کدھر گئے

حقا کہ نہیں کچھ حق و باطل سے مجھے کام
فرمائیں جو کچھ آپ مرے حق میں وہ حق ہے

دل ڈھونڈھنا سینے میں مرے بوالعجبی ہے
یہاں راکھ کا اک ڈھیر ہے اور خاک دبی ہے

کیا پوچھتے ہو موجبِ آزردگیٔ یار — دل لے چکے مدت ہوئی، اب جاں طلبی ہے
قائم نہ رہے کیونکہ ترے سامنے خاموش — جائے کہ تو ہے، بات بھی واں بے ادبی ہے

نے نالے میں تاثیر ہے، نے آہ میں یاں درد — معلوم ہو کس طرح تجھے چاہ کسی کی
تھا کس سے یہ وعدہ کہ طرح شمع کے قائم — دیکھا کیے ہم صبح تلک راہ کسی کی

کسے گلگشتِ گلشن کی ہوس ہے — اسیری کا جگر پر داغ بس ہے
جنوں کے ہاتھ سے گو ناتواں ہوں — گریباں تک تو میری دسترس ہے

اس سبزے کی طرح سے کہ ہو سنگِ راہ پر — پاؤں ہیں اک جہان کے یہاں ہم ملے گئے
قائم شباب ہی کے مناسب تھا شورِ عشق — جلنے دے اب یہ کام کہ وہ ولولے گئے

وہ چیز ہیں یادگار دوراں — تیرا ستم اپنی جاں فشانی

ایک شب جس نے تری بزم میں پائی ہو راہ — شمع ساں اپنی اسے آپ قدم بوسی ہے

غافل قدم کو رکھیو اپنے سنبھال کر یہاں — ہر سنگِ رہگذر کا دوکانِ شیشہ گر ہے

گریہ کو قائم تھما، مژگاں ابھی ہوں گے نہ خشک — دیر تک ٹپکے ہیں باراں کے شجر بھیگے ہوئے

شیخ جی مانا ہیں اس کو تم فرشتہ ہو تو ہو — لیک حضرت آدمی ہونا نہایت دور ہے
جلنے دے قائم کچھ آگے کیا قیامت ہوگا تو — اس بڑھاپے میں تو تیرے سر میں اتنا شور ہے

مت جا شمارِ دم پہ قائم کے تو، کہ یہاں — یہ خستہ فی الحقیقت مدت سے مر چکا ہے

پار ہے اس آہ بیں کا سپہر — ابھی تنک سانس لیا چاہیے
ہوش کی باقی ہے ہنوز اک خلش — اور بھی کوئی جام پیا چاہیے
زخمِ دل اس شوخ سے ہے یادگار — اس کو تو ناصح نہ سیا چاہیے
عشق تو قائم نہ ہوا آپ سے — اور ہی کچھ پیشہ کیا چاہیے

اس جہاں خانے سے مت پوچھ کہ جاتے کیونکر
پونجی لائے تھے کچھ اک دم سے، سو ہار چلے

قائم آ، رخت سفر باندھ، کہ یہاں سے اپنا
جی تو جانے کو نہ چاہے تھا، پہ ناچار چلے

شکوہ اغیار سے ہے نے یار کی بیزاری سے
جو ہوا ہم پہ سو اس دل کی گرفتاری سے

ہر قدم کوئے بتاں کارگہِ مینائی
تو رکھیو پا بچ کے سنبھالے ہوئے ہشیاری سے!

شور تجھ حسن کا گر عالمِ علوی میں نہیں
مہر و مہ جھانکے ہیں کیوں پردۂ زنگاری سے

ہائے قائم نہ تری آنکھ بھیگی اک دن
ابر روتا ہے سدا خوف سیہ کاری سے

زاہدو مسجد یہ خرابات کی تو نے
جی بھی یہی چاہے تھا کرامات کی تو نے

جلنے دے بس اب یار کہ یہ بھی نہیں کچھ کم
احوال کی دل سے جو مکافات کی تو نے

قائم رہ پُرپیچ ہے، اور دور ہے منزل
کب پہنچے گا ظالم، جو یہیں رات کی تو نے

خدا کسی سے کسی دل کو آشنا نہ کرے
یہ ابتلا ہے بری طرح کا خدا نہ کرے

بتوں کی دید کو جاتا ہوں دیر میں قائم
مجھے کچھ اور ارادہ نہیں، خدا نہ کرے

دیر و دل جانیے کیدھر ہے یہ یہ سنتے ہیں
یہاں سے جو قافلہ بھولا سو حرم پہنچا ہے

بے سبب یوں نہیں احوال یہ دل کا پیارے
تو بھی تو پوچھ کہ کیا اس پہ ستم پہنچا ہے

سالک اس وادیِ پرخوف کا ہوں میں کہ کوئی
آ کے جس راہ میں مقصود کو کم پہنچا ہے

خزاں میں غیر مروت ہے چھوڑنا گلشن
ہم اور رہ لئے چمن جب تلک ہوا نہ پھرے

بات جب اس زبان پر آئی
تیغ گویا فسان پر آئی

دیکھیں کرتا ہے کون سینہ سپر
جب وہ تیغ امتحان پر آئی

دل بے جرأت میں راز دل نہ رہا
بات جب تک کہ جان پر آئی

یوں ہی طوفاں طراز ہیں جو یہ چشم
تو پھر آفت جہان پر آئی

کھل گیا آپ ہی آپ کچھ قائمؔ
کیا بلا اس جوان پر آئی

نہ اس کی زلف سے چھٹنے کا قصد کر قائمؔ
کوئی سنا ہے کہ قید فرنگ سے چھوٹے؟

کوئی اپنی خاطر ایسا کہیں اک مکان ہووے
کہ نہ یہ زمین ہووے نہ یہ آسمان ہووے

رہ و رسم ناز پیارے ہے قدیم خوبرویاں
پہ نہ اس قدر کہ جی کا کسی کے زیان ہووے

میں تمام رات تجھ بن در غیر پہ سحر کی
نہ خدا کرے کسو سے کوئی بدگمان ہووے

نہ خفا ہو مجھ سے قائمؔ کہ روا ہے اس سے رنجش
جو کوئی کہ یک دو دم کا کہیں میہمان ہووے؟

کیا کیا عدم میں ہم پر ظلم و ستم نہ ہوں گے
چرچے یہی رہیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے

دریا دلی میں ساقی دیکھی تری کہ تو نے
یہ مے دی جہاں میں لب بھی اتنے تو نم نہ ہوں گے

یوں مجھ کو قتل کر تو، لیکن یہ ہے کہ پیارے
مارے سے ایک میرے عاشق تو کم نہ ہوں گے

مفت نظر ہے قائمؔ سیر وجود ورنہ
آئے نہیں عدم سے یا ہم عدم نہ ہوں گے

جو کچھ کہ اس میں ہو، شادی و غم غنیمت ہے
تو بے خبر ہے اس عالم سے، دم غنیمت ہے

کب تاب بلائے جاں نہیں ہے
کب آفتِ دل فغاں نہیں ہے

کب چشم پہ ناگوار تئیں خواب
کب دل پہ نفس گراں نہیں ہے

کب رات ہوئی کہ چشم تر سے
خونابۂ دل رواں نہیں ہے

سب کچھ ہے جو چاہیے مگر صبر
اک جنس ہے وہ کہ یہاں نہیں ہے

کہتا نہیں میں کہ ظلم ہے بد
پر خوب تو مہرباں نہیں ہے

وہ بھی کیا دن تھے کہ جی کو لاگ اک کے ساتھ تھی
میں تھا، اور کوچہ تھا اس کا، اور اندھیری رات تھی

گوش شنوا جب ہم پہنچا نہ کوئی یہاں تو آہ
لے گئے ہم ساتھ اپنے وہ جو دل میں بات تھی

چاؤ تھا رونے کا جن روزوں میں اپنی چشم کو
کھول کر آنکھیں جدھر دیکھے تھا میں برسات تھی

قائمؔ اس جینے پہ کوئی دم کے منصوبے ہیں کیا
جب تلک مہرے چلے گا تو یہ بازی مات تھی

اس انتخاب کی ترتیب اس طرح ہے:

تقریب کے عنوان سے قائم کے کلیات کے متعدد نسخوں کی موجودگی کی نشاندہی، فضول قسم کی متن حواشی والی تحقیق سے بیزاری، اور قائم کے کلام کی اہمیت کے بارے میں مختصر ترین اشارے ملنے کے بعد، قائم سے مستفید ہونے والے متاخرین کی ایک طویل فہرست میں سے علامت کے طور پر غالب کو منتخب کرکے اُنکے خطوط اور قائم کے اشعار کی روشنی میں "غالب کا قائم سے استفادہ (بلا تبصرہ)" بنا غالب کے اپنے مستفاد اشعار دیئے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس خلوص تبصرے کے بعد، اور غالب کو محض علامت ہی سمجھ کر اس انتخاب میں شامل متعدد اشعار پر بعد کے دوسرے مشاہیر نے غالب کے بقول جو "تصرفات" کیے ہیں توقع ہے کہ وہ اہلِ ذوق سے پوشیدہ نہ رہ سکیں گے۔

اس کے بعد قائم کے حالاتِ زندگی معتبر ترین ذرائع سے اس طرح پیش کیے گئے ہیں کہ سب سے پہلے خود نوشت ہے۔ اور اس کے بعد صرف معاصر اور ملاقاتی تذکرہ نگاروں کے بیانات دیے گئے ہیں۔ بعد والوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ خود نوشت اور یہ بیانات فارسی میں تھے ان کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد انتخاب ہے: مختصر سا فارسی اور پھر اردو۔ ہاں ایک بات رہی جاتی ہے۔ مجھے یہ شعر قائم کے قلمی کلیات میں نہیں ملا ہے۔

مجلسِ وعظ تو تا دیر رہے گی قائم
یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

ویسے یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ یہ شعر ابھی تک کسی اور شاعر کے یہاں بھی نہیں ملا ہے۔ قائم کے اس انداز کے مقطعے اس انتخاب میں ایک سے زیادہ تعداد میں موجود ہیں پھر فی الحال اسے بھی قائم کا کیوں نہ مانا جائے

پیش گفتار

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

یہ شعر آپ نے کتنی ہی بار سُنا ہوگا۔ یہ اُردو کے ان چالیس پچاس خوش نصیب ترین اشعار میں سے ہے جو ہر خوش ذوق کی زبان پہ رہتے ہیں، اور جنھیں مناسب مواقع پر نثر نگار اپنی نثر کا حُسن بڑھانے کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں۔

جس شاعر نے یہ شعر کہا ہے اُردو والوں کو اس کی جُستجو کرنی چاہیئے تھی کہ اس نے اور کیا کچھ کہا ہے اور کوشش کرکے اس کے معتبر کلام کو مرتب کرکے محفوظ کرلینا چاہیئے تھا۔ اس کی اشاعت کوئی لمبا چوڑا کام بھی نہ تھا۔ اس کے دیوان کی موجودگی کی اطلاع حسرت موہانی نے ۱۹۱۲ء میں اور میں نے ۱۹۵۳ء میں تفصیل سے اُردو دُنیا کے گوش گزار کردی

تھی۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ اس نے صرف ایک شعر کہہ کر اپنی اپج ختم کر دی ہو اور بے خبر ہو گیا ہو۔ حسرت کے اور میرے پیش کردہ انتخابات (اردوئے معلی ۱۹۱۳ء۔ معارف جنوری ۱۹۵۲ء) سے بھی کم سے کم اتنا ضرور پتہ چل جاتا ہے کہ دوسرے درجے کے شعر اس کے یہاں بھلے ہی مل جائیں، تیسرے درجہ کا شاعر وہ یقیناً نہیں ہے۔ پھر اسے اردو سماج کی ایک عام بےحسی، اور غیر ضروری کاموں سے ضروری کاموں کو الگ کر کے انھیں ترجیح دے سکنے کی بھاری کمی کے سوا اور کس چیز سے تعبیر کروں۔

تسکین جن کا نام میر حسین تھا، جو مومن کے سمدھی بھی تھے اُستاد بھائی اور شاگرد بھی تھے اور ہم عمر بھی، غالب، مومن اور ذوق کی دِلّی کے اس گمنام سے مگر نیک نام شاعر کا یہ شعر ہے، اور اس کی ان نیکیوں میں سے ہے جو کر کے دریا میں ڈال دی جاتی ہیں۔ نیکی کو سب یاد رکھتے ہیں اور اس کے کرنے والے کو اِنے گِنے لوگ۔

بظاہر تسکین شاعر ہی تھے کہ اس کے سوا ان کے کسی مشغلے، یا مصروفیت، کا علم کسی ذریعہ سے ہم تک نہیں پہنچا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ وہ مومن کے شاگرد تھے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ شاعر ہی نہیں، باقاعدہ شاعر تھے۔ ایسی صورت میں ان کے اتنے مختصر دیوان کی موجودگی جس میں صرف چند ردیفیں ہیں اور ان میں بھی کتنی ہی نامکمل غزلیں ہیں، جو یہ بتاتی ہیں، کہ

یا تو تلاشِ روزگار کے ذیل میں ان کا کلام ضائع ہوتا چلا گیا، یا پھر وہ کچھ ضرورت سے زیادہ نیک دل اور شریف طبع واقع ہوئے تھے اور ایسوں کے ساتھ زمانے کا برتاؤ ایسا ہی رہا ہے۔ اس آخری امکان کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ ان کے بارے میں حالات و سوانح کے سلسلے میں، اوروں کو جانے دیجیے، خود ان کے قریب ترین، شیفتہ نے صرف دو سطریں لکھی ہیں جن میں حالات صرف آدھی سطر میں ہیں، بقیہ میں کلام کی تعریف ہے۔ خدا بھلا کرے امیر مینائی کا، جن کی بدولت ان کے حالات، یا ضروری حالات، ہم تک پہنچ گئے اور اس میں بھی شاید اس بات کو دخل ہے کہ تسکین کا اخیر زمانہ رام پور میں گذرا، ورنہ اس کے بھی لالے پڑ جاتے! امیر مینائی کا یہ بیان تسکین کے انتقال کے بعد کا ہے، اور میں معاصر شہادتوں کے سوا اور کسی بیان کو اہمیت نہیں دیتا ہوں۔ لیکن امیر مینائی کے تذکرے کی نوعیت نیم سرکاری سی ہے، ریاست کی سرپرستی میں لکھا گیا ہے، اس لیے بھی، اور اس لیے بھی کہ وہ خود خاصے مستند قسم کے راوی اور عالم شاعر تھے، ان کے بیان کو بھی لگ بھگ وہی درجہ دیا جا سکتا ہو۔ انھوں نے ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں تسکین کے انتقال کے ۲۲ سال بعد لکھا ہے:

"تسکین، میر حسین، ابن میر حسن عرف میرن صاحب۔ سلسلہ ان کے نسب کا میر حیدر قاتل وزیر فرخ سیر تک پہنچتا ہے۔

فارسی مولوی امام بخش صہبائی سے پڑھی۔ شعر گوئی کا جو شوق ہوا، ابتدا میں شاہ نصیر مغفور سے اصلاح لی۔ انتہا میں مومن خاں صاحب مرحوم کے فیض سے مشق سخن آفرینی کمال کو پہنچی۔ وطن ان کا دہلی ہے، مگر اس دار الریاست (رامپور) میں سال ہائے دراز نوکر رہے۔ قدر افزائی رئیس قدر دان سے نامور ہے۔ پچاس برس کی عمر ہوئی۔ شوال کی سترھویں تاریخ بارہ سو اڑسٹھ ہجری میں قضا کی اور نواب احمد علی خاں بہادر مرحوم کے مقبرے کے قریب مدفون ہوئے، دیوان ان کا تو نہ ملا مگر متفرق کچھ اجزا ہاتھ آئے، ان میں سے یہ کلام منتخب ہوا۔"

(انتخاب یادگار)

"انتخاب یادگار" کے اس بیان کو اس لیے مزید استناد حاصل ہو جاتا ہے کہ مأخذ بڑی حد تک "گلستان سخن" ہے جو تسکین کے صرف تین سال بعد ۱۲۷۱ھ کی تصنیف ہے۔ گلستان سخن نے لکھا ہے:

"تسکین تخلص، زبدۂ خاندان سیادت، اسوہ دودمان سعادت میر حسین۔ نسب اس زبدۂ سادات کرام کا میر حیدر، قاتل وزیر فرخ سیر تک پہنچتا ہے۔ کتب فارسی کو جناب استادی مولوی امام بخش صہبائی سے پڑھا ہے اور چونکہ طبع نہایت موزوں تھی

شوق شعر گوئی نے غلبہ کیا، اوّل کلام کو شاہ نصیر مرحوم کی نظرِ اصلاح میں گزرانا۔ جب کچھ سلیقہ اس میں بڑھ گیا سررشتہ اصلاح کا چندے منقطع رکھا، لیکن پھر اپنے سخن کی تکمیل کے واسطے مومن خاں سے اصلاح لینی شروع کی۔ رفتہ رفتہ مشق سخن کمال کو پہنچی اور طرۂ ایوان سخن کنگورِ عرش تک۔ جو کج رفتاری فلک اہلِ ہنر کی دشمن اور کملائے فن کی عدو ہے۔ تلاش معاش کے ذریعہ سے سفر رامپور کا اتفاق ہوا۔ وہاں یا تو یہ آسمان نہیں یا اس وقت یہ نحس سررشت کسی اور امر خطیر کی طرف متوجہ تھا۔ رئیس رام پور کی قدر شناسی سے سلسلہ نوکری کا بقدر رفاہ حال منتظم ہو گیا۔ اس گلزمین کے شعرا نے پاکِ زبان اور خوش فکری کو مقبول رکھا۔ ۱۲۶۸ھ میں عین عالم شباب میں پیرزالِ دنیا کی صحبت سے بیزار ہو کر حورانِ بہشتی کی طلب میں روضۂ خلد کی طرف راہی ہوا۔ اُسی سال میں چند روز پہلے مومن و عارف کے سانحۂ ناگزیر سے قدردانانِ سخن کا سینہ داغدار، اور ہنر شناسوں کا دل افگار ہو چکا تھا کہ یہ واقعہ جانکاہ علاوہ رنج و ملال اور مزید اندوہ کلال ہوا قربان علی سالک نے تاریخ

وفات اس طرح سے پائی کہ بطریق معمّا کے ان دونوں سانحہ جانگداز پر بھی اشتمال رکھتی ہے :-

ارم میں مومن و تسکین و عارف

یعنی ان تینوں نام کے اعداد ارم کے اعداد میں شامل ہیں"۔

(گلستان سخن)

زندگی میں شیفتہ نے تو ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء میں صرف اتنا لکھنے پر اکتفا کی تھی :-

" تسکین تخلص، میر حسین، سلسلۂ نسبت بمیر حیدر خاں قاتل وزیر فرخ سیر میرسد۔ صاحب فکر بلند و اسلوب گفتارش دلپسند از حضرت مومن خاں بدر ستیٔ اشعار پرداختہ۔ از احباب راقم است"۔

(گلشن بے خار)

لیکن کریم الدین (فیلن) نے اپنی ذاتی معلومات سے شیفتہ کے جملے لے کر حالات میں کچھ اضافہ کر دیا۔ یہ شیفتہ کے کوئی دس برس بعد ۱۸۴۸ء کا ذکر ہے :-

" تسکین تخلص، میر حسین نام سلسلہ ان کے نسب کا میر حیدر خاں، قاتل وزیر فرخ سیر تک پہنچتا ہے۔ صاحب فکر

بلند اور اسلوب اس کی گفتار کا دلپسند۔ شاگرد حضرتِ مومن خاں سلمہ اللہ الرحمان کا، بندہ سے بھی تعارف حاصل ہے۔ سابق میں واسطے تلاش روزگار کے لکھنؤ کو گئے تھے۔ اب وارد میرٹھ ہیں تلامذین حضرت مومن خاں میں سے اچھی طبیعت رکھتے ہیں عمر ان کی ۱۸۴۷ء میں قریبا چالیس برس کے ہوگی۔"

(طبقات الشعرائے ہند)

سوانح میں مزید اضافہ یوں کر لیجئے کہ ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں دلّی میں پیدا ہوئے کہ انتقال کے وقت پچاس برس کی عمر تھی۔ دو بیٹے تھے۔ عبد الرحمن آہی اور میر عبداللہ غمگین غمگین کا ۲۳ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ آہی مومن کے داماد تھے۔ یہ مشہور شعر انھیں کا ہے ؎

ہے غلط دھوم کہ نکلا تھا وہ گھر سے باہر
شہر میں چاک کسی کا تو گریباں ہوتا

غمگین باپ کے ساتھ رام پور آکر عملۂ عدالت میں ملازم ہو گئے تھے۔ یہیں انتقال ہوا۔ تسکین اور غمگین کی قبریں نانکار میں احمد علی خاں کے مقبرے میں ہیں۔

تسکین کا یہ دیوان جو رام پور میں محفوظ ہے بظاہر دنیا میں

ایک ہی نسخہ ہے اس لیے اشعار کا مقابلہ یا ان پر اضافہ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، صرف تذکروں میں جو اشعار پائے جاتے ہیں' وہی اختلاف نسخ' قسم کی چیزوں کے کام آسکتے ہیں۔ چار شعروں کا اضافہ بھی ایک تذکرہ کی مدد سے ہو گیا ہے جس کا اپنی جگہ پر ذکر بھی کر دیا گیا ہے۔ یہ شعر کریم الدین کے "طبقات" سے لیے گئے ہیں۔ باقی اشعار کی تصحیح جہاں کہیں تحریر میں کوئی سقم تھا' کر دی گئی ہے۔

رام پور کی لائبریری میں تسکین کی ایک فارسی کے منتخب اشعار کی بیاض بھی موجود و محفوظ ہے' جیسی اس زمانے کے اکثر خوش ذوق رکھا کرتے تھے اور کوئی خاص بات نہیں۔

شاعری کے بارے میں کیا کہوں۔ اب تو پورا دیوان آپ کے سامنے ہے خود پڑھ کر اندازہ لگا لیجیے۔ پھر شاید آپ بھی اس نتیجے پر پہنچیں کہ شاعر اتنا برا یقیناً نہیں جس بُرے طریقے پر اسے نظر انداز کیا گیا۔

عابد رضا بیدار



بُت کدے میں دیکھ واعظ، آکے جلوہ نور کا
تُو صنم سمجھا ہے جس کو، ہے وہ پتھر طور کا
دیکھنا افغان لب، زخم دلِ پُر شور کا
سوزنِ جرّاح سے نکلے گا نالہ صُور کا
کچھ نمک، کچھ مُشک، کچھ الماس ہوا ے چارہ گر
پھر خدا چاہے بھرے دو دن میں منھ ناسُور کا
دار پر کھینچا انا الحق کہنے سے ناحق اُسے
چاہیئے تھا چیر کر دل دیکھنا منصور کا
مر گیا ہوں شعلہ رُو پر چاہیئے دوزخ مجھے
خُلد کو کب ہے تحمّل اس دلِ محرُور کا
ہم سیہ بختوں سے اُس کو گر نہ پڑتا کام ہائے
رنگ ایسا کاہے کو ہوتا شبِ دیجور کا

یادِ روے آتشیں نے دی وہ داغِ دل کو آگ
جل اُٹھا جوں شمع پھاہا مرہم کافور کا

ساکنانِ تُو فلک پر دیکھیے کیسی بنے
نالۂ سوزاں کا ہے اب کی ارادہ دُور کا

کیوں نگہ بے صرفہ مثل جام محفل میں نہیں
نشہ ہے ساقی کو اپنی نرگسِ مخمُور کا

بلہ حواسی ہجر کی شب کی ہے چہرے پر عیاں
کیا ارادہ ہے خدا جانے ترے مجبور کا

ذکر کچھ کچھ کر کے اُس پردہ نشیں کے حُسن کا
خُلد میں تسکین نے دیکھا تماشہ حُور کا

(۲)

نام لو گے جبریاں سے جانے کا
آپ میں پھر نہیں میں آنے کا

ہم کو طوفِ حرم میں یاد آیا
لڑکھڑانا شراب خانے کا

دم لے اے چشمِ تر کہ دیکھوں میں
عالم اس گُل کے مُسکرانے کا

دیکھ سکتے نہیں وہ میرا حال
کیا سبب کہیے مُسکرانے کا

دلِ صد چاک کی بنا صورت
زُلف پر دل گیا ہے شانے کا

اب کی چھوٹوں قفس سے گلشن میں
آشیاں میں نہیں بنانے کا

جلوہ اس ضد سے وہ دِکھا دینگے
ہم کو دعویٰ ہے تاب لانے کا
سُن کے وہ حال کہتے ہیں تسکیں
نام بھی کچھ ہے اِس فسانے کا

(۳)

خنجر ترے ہاتھوں میں سنبھل جائے تو اچھا
قاتل مرا ارمان نکل جائے تو اچھا
مرجائینگے پر دل نہ لگائیں گے کسی سے
جی اور کسی ڈھب سے بہل جائے تو اچھا
ہر روز وہ ڈھونڈھے ہے کوئی تازہ خریدار
صورت مری ہر روز بدل جائے تو اچھا
آنے سے ترے جان تو ٹھیری تھی کوئی دم
اک دم کیلئے جی بھی سنبھل جائے تو اچھا
تا حشر ترے دام سے مشکل ہے رہائی
اس سودے کا مر کر بھی خلل جائے تو اچھا
مرکر بھی یہ کہتا ہوں کہ جو جی میں ہے میرے
اس دم کی طرح جی سے نکل جائے تو اچھا
ہر شعر صفائی میں ہے اس رُخ کی برابر
تسکین وہاں یہ بھی غزل جائے تو اچھا

(۴)

کوئی کبتک کہے دیدار کو دکھلا دکھلا
آج ہی حشر سہی، جلوہ تو اپنا دکھلا
بات کرنے میں ہے ہر دم جو حجابِ آئینہ
دیکھتا کیا ہے، مجھے بھی تو خود آرا دکھلا
دیکھیں کیا میری طرف یاد ہیں ان کو اپنی
چتمکیں غیر سے کرنہیں، مجھے دکھلا دکھلا
لطف جب ہے نیست کا ہو برہمن موہ وہ غیرتِ حور
محتسب کو ہیں ہم ساغرِ صہبا دکھلا

ذبح کرتے ہیں وہ اس شرط پہ ہمدم مجھ کو — کہ تڑپ کر مجھے تو اپنا تماشا دکھلا
غش ہوئے پر بھی مری طرح کھلی ہیں آنکھیں — سچ کہو آئینے نے تم کو دیا کیا دکھلا

جان دیتا ہے ہر ایک بات کو تسکیں کر یاد
تم نے، کیا، اس کو دیا اپنا سراپا دکھلا

(۵)

اس کوء میں موئے ہم، وہ لب بام نہ آیا — اے جذبۂ دل، تو بھی کسی کام نہ آیا
تھا میری طرح غیر کو بھی دعوئ الفت — ناصح تو اسے دینے کو الزام نہ آیا
بے بال و پری کھوتی ہے توقیر اسیری — صیاد یہاں لے کے کبھی دام نہ آیا
اس ناز کے صدقے ہوں تجھے میں کہ عدو سے — سو بار سُنا ہے، پہ مرا نام نہ آیا
کیا جانیے کس طرح دیا تو نے جواب آہ — قاصد کی زباں پر ترا پیغام نہ آیا

تسکین کرے دل کیا دل مضطر کا علاج اب
کمبخت کو مر بھی تو آرام نہ آیا!

(۶)

تو ایک ہی پُرفن ہے تجھے کیا نہیں آتا — پر رحم مرے حال پہ حاشا نہیں آتا
آنے کی ترے گھر میں مرے کس نے اڑائی — دشمن کو تو ہر بات کا چرچا نہیں آتا
کیا لطف ہے انکار میں قاصد کی زبانی — کہنا وہ کس انداز سے ہوگا نہیں آتا
بے وجہ ہر اک بات پہ رنجش ہے ہمیں سے — دشمن پہ کبھی آپ کو غصہ نہیں آتا

جلنے سے تو قاصد کے ہو ہیچ دل کو تسلّی　　کیا جانیئے آتا ہو وہ یاں، یا نہیں آتا

جس وقت نظر پڑتی ہے اس شوخ پہ تسکیںؔ
کیا کہیئے، کہ جی میں مرے کیا کیا نہیں آتا

(۷)

سلجھا کے اس کی زلف گرفتار ہو گیا　　تھا کام سہل، پر مجھے دشوار ہو گیا
یعقوب ہی کا رشک زلیخا کو کم نہ تھا　　یوسف کا کیوں جہان خریدار ہو گیا
سوئے وہ ساتھ شب کو مرے ہاتھ باندھ کر　　میں بخت کو جگا کے گنہگار ہو گیا
مرتا ہوں اس پہ گو وہ قیامت ہی کیوں نہ ہو　　ہم سے بھی اس کے ملنے کا اقرار ہو گیا
کیا منھ دکھاؤں وصل میں اس کو کہ ہجر میں　　کہتا تھا اپنی جان سے بیزار ہو گیا

تسکیںؔ کے چلیئے گھر، کہ وہ مہماں ہے کوئی دن
کہتے ہیں اس کو عشق کا آزار ہو گیا

(۸)

وفا کی، لطف کچھ اس کا نہ پایا　　شگوفہ گل ہوا، ثمرہ نہ پایا
تمہیں بھی کھولنی زلفیں پڑیں گی　　دلِ گم گشتہ گر اپنا نہ پایا
نہیں یہ برق میں سرعت الٰہی　　کہ نالہ منھ سے جب نکلا نہ پایا
ہوئی اپنے سے کیا کیا جنگ اپنی　　جب اس کو جانبِ اعدا نہ پایا
ملے سو خضر اس کی جستجو میں　　یہ کیا پایا کہ جو ڈھونڈا نہ پایا

بہت کوچے کی اس کے خاک چھانی — مگر نقدِ مراد اپنا، نہ پایا
رفو کو ہاتھ کیا پھیلائے ناصح — گریباں کا کوئی ٹکڑا نہ پایا
جگاتا بختِ خوابیدہ کو لیکن — کبھی اس ماہ کو تنہا نہ پایا

جہاں میں کوئی کام آیا نہ تسکینؔ
کسی کو میں نے یاں اپنا نہ پایا

(۹)

جان کو انتظار ہے کس کا — دیدہ اُمیدوار ہے کس کا
زہر کھاتا ہوں ہجر میں لیکن — موت پر اختیار ہے کس کا
شوخیاں اس کی یاد آتی ہیں — ہائے دل بیقرار ہے کس کا

دیکھ سنبل کو کہتے ہیں تسکینؔ
طرۂ تابدار ہے کس کا

(۱۰)

ملا جو داغ جبیں کو ہے، روشنائی کا — حصول ہے یہی مسجد کی جبہ سائی کا
اجل کہاں شبِ غم میں مگر وہ آتے ہیں — کہ جان و دل کو ارادہ ہے پیشوائی کا
بُتوں کے ملنے سے زاہد ہوا ہے کیوں مانع — نہ اپنے سر پہ اُٹھا مظلمہ خدائی کا
تمہارے سامنے ہوتے ہی کھل گئے جوہر — بہت غرور تھا آئینہ کو صفائی کا
صبا نے لاکھ طرح شاخِ گُل کو دی جنبش — ادا سے دیکھ لچکنا تری کلائی کا

خدا گرے کہیں اُس بُت کو دیکھے واعظ　　بہت مغرور ہے حضرت کو پارسائی کا

نہیں ہے اور کوئی لامکاں میں اے تسکیںؔ
گلہ میں کس سے کروں اپنی نارسائی کا

(١١)

ہجر کی شب میں نہ آئیگی تو کیا ہوئے گا　　کام ہم سے کبھی تجھ کو قضا ہوئے گا
جی ہے بیتاب وہ دشمن سے ملا ہوئے گا　　بار چاہیں ہو کہیں کہنے سے کیا ہوئے گا
زندگی ہووے گی کس طور سے یارب اپنی　　دم میں سو بار اگر یوں وہ خفا ہوئے گا
آج آتے ہیں جو کچھ شکوے کے مضموں جی میں　　اس نے نامہ کوئی دشمن کو لکھا ہوئے گا
حق کے کہنے سے نہیں ٹلتی ہے سولی منصور　　تو نے دعویٰ کہیں اُلفت کا کیا ہوئے گا
اس پہ کیا گزریگی دیکھے سے طوافِ کعبہ　　ایک دم یار کے جو گرد پھرا ہوئے گا
اتنی سُرخی شفقِ چرخ میں کس دن تھی مگر　　عاشقِ زار کا کچھ رنگ اُڑا ہوئے گا
گھر میں برہم ہے جو وہ فتنۂ دوراں ہمدم　　مجھ پہ طوفان کوئی تازہ اُٹھا ہوئے گا
آج جو عرش پہ ہے اپنا دماغ اے ظالم　　کوئی دشمن تری نظروں سے گرا ہوئے گا

کام کیا حورِ بہشتی سے ہے واعظ اس کو
جس کو انسان کی چاہت کا مزا ہوئے گا

(١٢)

تیرا قول و قرار تھا کیسا　　تجھ کو مجھ سے پیار تھا کیسا

اب جدائی میں جاں گئی اپنی — عشق ناسازگار تھا کیسا
عشق نے ہائے کھو دیا ہم کو — یار کو اعتبار تھا کیسا
پھر خود آرائیاں لگے کرنے — شب تمھیں انکسار تھا کیسا
تلخ کامانِ وصل سے مت پوچھ — بادہ، شب، خوشگوار تھا کیسا
ساعتیں گن کے رات کاٹی ہے — انگلیوں پر شمار تھا کیسا
اصل مطلب نہ کچھ کہا اُن سے — نامہ بر رازدار تھا کیسا
مے تو پیتے تھے روز کل ساقی — لطفِ ابرِ بہار تھا کیسا
تم کو بھی یاد ہیں وہ دن، کہ ہمیں — آپ پر اختیار تھا کیسا

بخشش تسکیں کو بے حساب، ترا
وعدہ آمرزگار تھا کیسا

(۱۳)

کرتے تو ہیں اس بت کو اگر رام نہ ہوگا — زاہد کی نظر میں ہمیں الزام نہ ہوگا
اس بزم میں آتا نہیں توبہ کا خدا پاس — ناصح تجھے ساقی نے دیا جام نہ ہوگا
مر جائینگے ہم اور کسی طرح شبِ ہجر — گر موت کا کچھ تجھ سے سرانجام نہ ہوگا
کیا رکھیں توقع کہ دمِ مرگ ملیں گے — اس وقت بھی آنا ترے خودکام نہ ہوگا
ناداں مری رسوائی کی مت کیجو شکایت — بے نام نہ ہوگا تو ترا نام نہ ہوگا
اس ڈھب کے تڑپنے سے یقیں ہے مجھے اے شوخ — تسکیں کو پسِ مرگ بھی آرام نہ ہوگا

(۱۴)

نہیں ملتا دماغ قاصد کا
اس کے خط کا جواب کیا لایا

ربط اپنے دکھانے کو مجھے بخبر
نام سے آپ کے بُلا لایا

یہ نہ لکھتے وہ مجھکو اے قاصد
اور سے خط ہے تو لکھا لایا

اپنی مسجد میں لائینگے واعظ
اب کی اس بت کو گر خدا لایا

بیٹھے تسکیںؔ تھے روٹھ کر وہ شوخ
دے کے دو جھڑکیاں اُٹھا لایا

(۱۵)

دیا دل کس کی قامت پر، کسے سرو رواں باندھا
یہ بہتاں تو نے مجھ پر بیگنہ، اے بدگماں باندھا

جلایا سوزِ اُلفت نے وہاں بھی، دیکھنا قسمت
پے آرام گر طوبےٰ پہ ہم نے آشیاں باندھا

نہیں آگاہ شاید صنعتِ اغراق سے تسکیںؔ
تری دم کی جدائی کو فراق جاوداں باندھا

(۱۶)

تنگ ہیں وسعت کے ہاتھوں جوشِ سودا ہو چکا
دو قدم چلنے نہ پائے تھے کہ صحرا ہو چکا

بات میری بھی سمجھ، ناصح، نصیحت ہو چکی
دل دیا جس نے وہ عاشق اور دانا ہو چکا
دیکھنا خانہ خرابی عشق تب اس پر کھلا
جب کہ میں کم بخت اک عالم میں رسوا ہو چکا
زلفِ پُرخم سے کہو اب اس کی پیچش ہے عبث
اس کے تِل کھانے سے پہلے مجھ کو سودا ہو چکا
دیکھ کر اس شوخ کو تسکیں ہوئے بیتاب کیا
تھا جو کچھ صبر و تحمّل کا وہ دعویٰ ہو چکا

(۱۷)

بے خطا ہیں تیری زلفیں واہ وا — میں نے سونگھا تھا مجھے سودا ہوا
دیکھئے کہتا ہے کیا مجھ پر بنی — نامہ بر آتا ہے کچھ گھبرا ہوا
دیکھ کر قامت کی اس کے راستی — ناصحِ کم فہم بھی سیدھا ہوا
کی نصیحت اور ناصح نے مجھے — اس گلی میں گر کوئی رسوا ہوا
کہتے ہیں تسکین ان سے حالِ دل
وہ یہ کہتے ہیں کہو پھر کیا ہوا

(۱۸)

رحم کس کو دمِ فریاد آیا — مجھ کو نالے کا اثر یاد آیا

کیوں کھلی رہ گئی چشمِ حیراں
کیا ترا روزنِ در یاد آیا

بھول جائینگے وہ اغیار کو ہیں
مر گئے پہ بھی اگر یاد آیا

وحشت اب لاش کو لے بھاگیگی
تنگیِ گور سے گھر یاد آیا

گریہ ابر پہ کیوں ہنستے ہو
کیا مرا دیدۂ تر یاد آیا

پھر گئی آن کے جاں ہونٹوں سے
کون ہنگامِ سفر یاد آیا

رہ گئے دستِ حنائی کو دیکھ
کون سا دستِ نگر یاد آیا

دلِ صد پارہ کے خوں ہوتے ہی
ناخنِ غم کو جگر یاد آیا

کوچۂ یار میں ہم نے تسکیں
پاؤں رکھا تھا کہ سر یاد آیا

(۱۹)

اِس سے بہتر تھا جو دوزخ میں ٹھکانا ہوتا
بزمِ دشمن میں ترے ساتھ نہ جانا ہوتا

لاکھ ڈھب یار بنا لینے کے ہیں درباں کے
اس کے در تک کوئی جانے کا بہانا ہوتا

دے کے دل ان سے وہیں قول و قسم ہم نے لیا
اور کیا دل کے لگانے کا سلیقہ ہوتا

جھوٹے ہیں وصل کے پیغام یہ سارے قاصد
آپ آتے وہ اگر اور ارادہ ہوتا

چاہیں سو غیر کہیں، سامنے اس بد خو کے
ہم بھی کچھ کہتے اگر کہنے کا یارا ہوتا

کیا ہوا طوفِ حرم سے تجھے حاصل زاہد
پوجتا بُت کو تو رہبانِ کلیسا ہوتا[1]

حُسن کم حوصلہ ہے دشمنِ ناموس وفا
آپ سے تو نہیں، ناصح، کوئی رسوا ہوتا

حال سنتے ہی مرا وہ یہ ہوئے پردے میں
میں نے اے کاش عزیزوں سے چھپایا ہوتا

خار پامال کیے، تنکے چُنے، صاف کیا
اس پہ وحشت کو مری تنگ ہے صحرا ہوتا

نامہ بر شکر ہے، دشمن نے نہ دیکھا، تو نے
لے کے خط ان سے مرا نام مٹایا ہوتا

---

[1] اصغر گونڈوی:- صنم خانے میں کیا دیکھا کہ جا کر کھو گیا اصغر
حرم میں کاش رہ جاتا تو ظالم شیخ دیں ہوتا

سب یہ کہتے ہیں بُرا ہوتا ہے دل کا آنا
پہلے ہی جی سے گزرتے جو ہم، اچھا ہوتا
غیر پر آپ کے آتے ہی کُھلا رازِ نہاں
اس سے تم آپ نہ چھپتے جو چھپایا ہوتا
کوستے ہیں مجھے وہ، ہائے کروں کیا تسکیںؔ
آپ کچھ کھا کے تو مرنا نہیں اچھا ہوتا

(۲۰)

ثابت تمہارے پوچھنے سے مدعا ہوا
حیران ہوں کہ دل مرا پہلو سے کیا ہوا
سنبل کو پیچ و تاب دکھا دیں گے ہم ابھی
عقدہ جو کوئی زلف سے اس گل کی وا ہوا
اس جانِ جاں سے اور عدو سے بگڑ گئی
گزرا جو آج ہے وہ مجھے دیکھتا ہوا
آنا ہے تو کہاں سے جو کہتا ہی کچھ نہیں
قاصد سمجھ کے بات تو کہہ تجھ کو کیا ہوا
کیا پوچھتے ہو ملنے سے کیوں یاس ہے مجھے
تسکیںؔ بے سبب ہی وہ اب کی خفا ہوا

(۲۱)

نہیں ہے جنسِ گراں پر بھی قدرداں میرا
رہا سفر ہی میں ہمواره کارواں میرا
وہ رازدار نہیں جو ہے رازداں میرا
زبانِ خلق پہ پہنچا دیا بیاں میرا
نہ پوچھ سوزِ محبت کی چارہ فرمائی
ہر ایک زخمِ جگر ہے نمک فشاں میرا

جو مجھ پہ گذری ہے جی جانتا ہے ای ہمدم
نہ پوچھ حال نہیں قابلِ بیاں میرا

اُٹھاؤں غیر کو اس بزم سے ابھی تسکیںؔ
جو بیٹھے چین سے اک دم دلِ تپاں میرا

(۲۲)

نکلا نہ حرف منہ میں جو اپنی زباں میں تھا
تیغالہ زیرِ نالہ یہ کام و دہاں میں تھا

لیتے تھے سر پہ گھر کو اُٹھا شورِ نالہ سے
وہ دن گئے جو زور تنِ ناتواں میں تھا

آئیں نماز پڑھتے ہیں شب مجھ کو ہچکیاں
کیا جانے ذکر کیا مرا بزمِ بتاں میں تھا

کیونکر نہ سب ہوں خوش کہ ہوا صرف مجھ پہ وہ
کینہ بھرا ہوا جو دلِ آسماں میں تھا

کس کس طرح سے بزم میں بیٹھے نہ منہ بنا
وہ دیکھتا ہے بس کہ یہ اپنے گماں میں تھا

کھائی ہے اس نے میرے لہو پینے کی قسم
نکلا وہ اب جو دم کا بھروسا جہاں میں تھا

تسکیںؔ جاں بلب ہے لگا تیرے منہ پہ منہ
مت پوچھ کیا اثر تری کافر زباں میں تھا

(۲۳)

ہم کو ہر دام میں لازم ہے پھنسانا دل کا
سیکھے ہیں تیری لگاوٹ سے لگانا دل کا

بن سُنے اُس کو کہانی کے نہیں آتی نیند
جب سے مشہور ہے عالم میں فسانہ دل کا

ایسے دیوانے کا عالم میں نہیں اور علاج
تھامنا سب تری زلفوں میں پھنسانا دل کا

جی پہ جو گزری ہے تسکیںؔ نہ کہنا ہرگز
ایسے بے رحم کو کیا حال سُنانا دل کا

(۲۴)

اس سرو قد کے رُخ سے لگا کرنے ہمسری — آئینہ ہو نہ جائے سزاوار دار کا
بے طاقتی سے ہاتھ جو ہلتے نہیں جنوں — ملتا نہیں دماغ گریباں کے تار کا
قسمت تو دیکھیے جتنے کیے شکوے ہجر کے — ان کو گماں ہوا گلۂ روزگار کا
بیتاب کیوں نہ ہوں تری شوخی کو دیکھ کر — آتا ہے حال یاد دلِ بے قرار کا
اس سبزۂ خط پہ بس نہ چلا زہر کھا موئے — مجبور ہو کے کام کیا اختیار کا

بے داد خواہ کس کے ستم کا یہ اے خدا
تسکیں کو انتظار ہے روزِ شمار کا

(۲۵)

حالِ دل کہہ کے شرمسار ہوا — اس کو ہرگز نہ اعتبار ہوا
حشر میں کیا کریں گے ان سے حساب — ہم پہ کیوں ظلم بے شمار ہوا
نالہ بھر کر مری طرح بلبل — گل کو چاہت کا اعتبار ہوا
میرے داغِ جگر کی صورت میں — گل ترے کیوں گلے کا ہار ہوا

ہاتھ پہلو سے پھر جدا نہ ہوئے
خواب میں وہ جو ہمکنار ہوا

(۲۶)

غیر کا شکوہ بجا ہے مجھے اب پردہ نشیں — کون تھا یہ جو اٹھائے تری چلمن آیا

چاہیے تھا اُسے انعام جوابِ خط پر | بن کے قاصد جو مری جان کو دشمن آیا
لے چلے جانبِ فردوس فرشتے مجھ کو | فاتحہ پڑھنے کو وہ جو سرِ مدفن آیا
گرچہ اک عمر سے ہے دست و گریباں میں ربط | ہے یہ افسوس کہ ہاتھ اس کا نہ دامن آیا
ٹھیر کر جان تو لینا ملک الموت ذرا | دھیان اُس لب کا ہے مجھ کو دمِ مردن آیا
وعدۂ حشر پہ ٹھہرایا ہے دل کو یارب | پھر قیامت ہے جو وہ جانبِ مدفن آیا

دل کو لے ہاتھ میں بیٹھا ہوں سرِ رہ تسکینؔ
آپ لے لے گا جو یاں تک کوئی رہزن آیا

(٢٧)

چلے اِس طرح، جوں سروِ چراغاں ہو محرم کا
پڑے طوبےٰ پہ گر سایہ ہمارے نخلِ ماتم کا
ہزاروں مر گئے دیکھا جو عالم سوگ میں اِس کا
لباس، آیا تھا وہ کافر پہن کر میرے ماتم کا
کیا آہوں نے، اس کافر کے ہے دل میں اثر دیکھو
غلط ہے یہ جو کہتے ہیں، بھروسا کچھ نہیں دم کا

(٢٨)

ہائے مرتا ہوں میں، وعدہ ہے یہ کل کا کیسا | میری جینے کا ہے صاحب کو بھروسا کیسا
سیرِ گلشن کے لیے جاتے تو ہو غیر کے ساتھ | دیکھنا میں بھی دکھاتا ہوں تماشا کیسا

میں نے اس زلف کو سونگھا ہے مری جانے بلا — مشک کیا چیز ہے اور عنبر سارا کیسا

شکل اچھی بھی جو دیکھو تو بگڑ جاتا ہے — ہائے اس دل نے کیا ہے مجھے رسوا کیسا

تھامے پہلو میں وہ غیرتِ یوسف شب کو — خواب دیکھا ہے نیا تو نے زلیخا کیسا

گو نہیں بام پہ دیکھا اس کو دیا دل تسکیں ہے

ہر گلی کوچہ میں ہوتا ہے یہ چرچا کیسا

(۲۹)

ناصح اس اضطراب میں اب کے یقیں ہوا — سچ کہتے ہو مجھے کہ تو عاشق کہیں ہوا

ہم گنتے رہ گئے شکنِ زلف خم بہ خم — دل مبتلائے عشوۂ چیں بر جبیں ہوا

میں بیوفا ہوں سچ ہے بتا اتنا بدگماں — دشمن کی بات کا مجھے کیونکر یقیں ہوا

اے دل اسیر ہونے میں اب تو کمی نہ کر — صیاد کو غضب ہے کہ داغِ کمیں ہوا

لایا جواب نامے کا قاصد کی شان دیکھ

مجھ کو یقینِ آمدِ روح الامیں ہوا

(۳۰)

میں دم کو سنبھل جاتا، قاصد کا بھلا ہوتا — گر تم کو نہ آنا تھا وعدہ ہی کیا ہوتا

کرتے ہیں سفارش سب، ناصح بھی گیا ہوتا — یوں وعظ جو کرتا ہے کچھ ان سے کہا ہوتا

ہم یاد میں اس قد کی نالے ہیں کیا کرتے — محشر کا سا ہنگامہ ہر شب ہے بپا ہوتا

سنتے ہیں ہوا دشمن کیوں کر مجھے یاد رہو — تم مجھ سے نہ یہ کہتے کچھ تم نے سنا ہوتا

جو چاہو سو کہہ گزرو، پر اتنی خبر رکھو — کیا کرتے ہو تم بیٹھے، عالم میں یہی کیا ہوتا

تھوڑا سا کہیں اپنا ہم حال دکھا دیتے — اک دم بھی اگر تم سے آئینہ جدا ہوتا

بیتابی سے دل اک دم تھمتا ہی نہیں، ہے ہے — کمبخت ابھی ان کی نظروں سے گرا ہوتا

اب ہم سے مرتا ہوں، رستہ نہ کہیں بھولے — پہنچانے کو قاصد کے میں آپ گیا ہوتا

(کرتے ہیں سفارش سب، ناصح مری ان جا کر — تم نے بھی ذرا ان سے کچھ منہ سے کہا ہوتا)

تم صبر کرو تسکیں کرنے دو ستم ان کو
دو دن کے تامل میں، دیکھو تو یہ کیا ہوتا

(۳۱)

رنگ الفت سے نہیں اڑتا ہے گر تعویذ کا — سونا کیوں میلا ہوا اے سیمبر تعویذ کا

ڈر ہے عالم کو مری وحشت سے بعد از مرگ بھی — ورنہ کیا تھا کام میری گور پر تعویذ کا

سر جو رکھا پاؤں پر تو رحم اس کو آگیا!
نقش پیشانی میں پنہاں تھا اثر تعویذ کا

(۳۲)

غیروں کو اشارہ ہے مرے قتل پہ ناحق — یہ جنبش ابرو ہے تو سر کا ہے کو ہوگا

(۳۳)

آہوں نے سوز نہاں شب بھر جتا کے چھوڑا — اک گنج تھا کہ آگے اس دلربا کے چھوڑا

پیماں پہ ہاتھ اس کا قابو میں آ چکا تھا — یہ سادگی ہے دل کی مجھ کو بلا کے چھوڑا

اُس بد مزاج کے میں کیونکر نہ جاؤں صدقے	غیروں نے واں کا جانا پھر تنگ آ کے چھوڑا

آزاد تو ہوں لیکن وہ صیدِ ناتواں ہوں
صیاد نے بھی جس کو کچھ رحم کھا کے چھوڑا

(۳۴)

اس در سے نہ جاؤں گا کبھی لاکھ کہو تم	دشمن ہی سہی تابع فرمان تمہارا
ہوتے ہو عبث دیکھنے سے میرے خفا تم	کیا اس میں بگڑتا ہے مری جان تمہارا
یاں آئے سو کس واسطے جلتا ہے ہمارے	عاشق تو نہیں ہے کہیں قربان تمہارا

مشتاق ہوا پھر اسی ظالم کا صد افسوس
تسکیںؔ نہ سمجھا دل نادان تمہارا

(۳۵)

سہل سمجھے ہو اس کا آ جانا	تم نے تسکیںؔ دل کو کیا جانا

(۳۶)

نہ آئے اس پہ بھی مرنا تو سو سو ننگ ٹھہرایا	قضا کو ناتواں ہم نے اجل کو لنگ ٹھہرایا
صدائے چاک پیراہن بھلی لگتی ہے وحشت میں	جنوں نے رشتۂ جامہ کو تارِ چنگ ٹھہرایا
ہوا غیروں کا منہ فق دو ہی ان میں دیکھ مجھ کو	اگرچہ جان دی ہے پر نہ منہ پہ رنگ ٹھہرایا
مجھی سے پوچھیے ہے ہر دم و رشکِ غیر کی معنی	کتابِ دل کو اس نے نسخۂ فرہنگ ٹھہرایا
گزر اس ناتواں کا کب ہوا اس کوچہ میں جس نے	نگاہِ مور کے میداں کو سو فرسنگ ٹھہرایا

نہ رکھا اسکے کوچہ میں مجھے اک آن کو دیکھو — مرے طالع کی گردش نے فلک کو تنگ ٹھہرایا
گیا مجنوں نکل صحرا کو یہ دیوانگی دیکھو! — فضائے کوچۂ لیلیٰ کو اس نے تنگ ٹھہرایا

(۳۷)

رہنے والوں کو ترے کوچے کے یہ کیا ہو گیا
میرے آتے ہی یہاں ہنگامہ برپا ہو گیا
تیرا آنا تھا تصوّر میں تماشا شمع رو
میرے دل پر رات پروانوں کا بلوا ہو گیا
ضبط کرتا ہوں ولے اس پر بھی ہے یہ جوش اشک
گر پڑا جو آنکھ سے قطرہ وہ دریا ہو گیا
اس قدر مانا برا میں نے عدو کا سن کے نام
آخر اس کی ایسی باتوں کا تماشا ہو گیا
کیا غضب ہے التجا پر موت بھی آتی نہیں
تلخ کامی پر ہماری زہر میٹھا ہو گیا
دیکھ لو خانہ خرابی غیر واں قابض ہوا
جس کے گھر کو ہم یہ سمجھے تھے کہ اپنا ہو گیا

(۳۸)

ہے غنیمت اسے ہر روز تماشا ہونا — کام آیا مرا اس کوچے میں رسوا ہونا

خوبصورت نہ ہو کوئی تو نہ ہو بد نامی   سچ تو یہ ہے کہ بُرا ہوتا ہے اچھا ہونا

عشق میں ہوتی ہیں مر کر بھی بلائیں، دیکھو
میری قسمت میں لکھا ہے ابھی کیا کیا ہونا

(۳۹)

کہتے ہیں رنجشِ ظاہر میں مزا آتا ہے   یوں ہی تم مجھ سے ذرا ہو کے خفا مل جانا

(۴۰)

میں چپ پڑا رہا دلِ بسمل نے کیا کیا!
جنبش نہ کی، یہ ابروئے قاتل نے کیا کیا!
کھولے ہے اس کی زلف گرہ در گرہ کے پیچ
جی لگ گیا تو عقدۂ مشکل نے کیا کیا!

(۴۱)

چپ لگی مجھ کو تو چرچا ہی پھر واں ہوگا
راز اپنا نہ خموشی میں بھی پنہاں ہوگا
جان جائے گی تڑپتے ہی تڑپتے تسکیں
بے قراری سے مری درد کا درماں ہوگا

(۴۲)

تم کو بھی تو غیروں سے یہ اخلاص نہیں ہے   جو ربط کہ اس دست و گریباں میں دیکھا

(۴۳)

ذکرِ تسکیں نے کیا آپ سے جانبازی کا
ایک حیلہ ہے یہ شاعر کی سخن سازی کا
تُو کہاں پردہ نشیں، صحبتِ اغیار کہاں
شوق ناصح کو ہے کیا شعبدہ پردازی کا
مار ڈالے نہ کوئی تیغِ نگہ سے تسکیں
تم کو چسکا ہے بہت ہائے نگہ بازی کا

(۴۴)

بات کو کہتے ہیں، ہوتی ہو دہن سے پیدا   تُو بھی کچھ کہہ کہ دہن ہووے سخن سے پیدا

(۴۵)

اُس نے مارا خلق کو اِس نے ڈبویا اک جہاں   تیرا ہنسنا اور مرا رونا برابر ہوگیا
شور یہ برپا کیا اس کے خرامِ ناز نے   داورِ محشر کا سارا کھیل ابتر ہوگیا[1]

(۴۶)

نمایاں ہو کچھ آہوں سے اثر آج   کوئی ہو جائے شاید کارگر آج
نہ جا ایجان تو دشمن کے گھر آج   کہ ہم بچتے نہیں آتے نظر آج

---

[1] یہ شعر دیوان میں نہیں، کریم الدین سے لیا گیا ہے۔

جو تجھ میں جذبِ دل تاثیر ہی کچھ — تو آئیگا اُدھر سے نامہ بر آج
لیا کیوں نام دشمن چڑ سے میری — مجھے چھیڑا ہے تم نے جان کر آج
سبب کیا ہو بتا تو اے شبِ ہجر — نہیں ہوتی نہیں ہوتی سحر آج
کبوتر لے گیا واں نامۂ غیر — سنی اُڑتی سی میں نے یہ خبر آج
کہو سیج وصل کی ٹھہری ہو کس سے — کہ عالم اور ہی ہے آپ پر آج

عجب صورت بنی ہے غم سے تسکیں
پڑی ہے حال پر اپنے نظر آج

(۴۷)

کچھ بھی سمجھا وہ مدعا قاصد — پڑھ کے خط اس نے کیا کہا قاصد
دیں گے سب کچھ تجھے، کہ مرتے ہیں — تو اگر جلد آئے گا قاصد
مت چھپا نامہ غیر کا ہم سے — تو ہمارا ہے آشنا قاصد
پڑھ کے خط تجھ سے پہلے آئیں گے — رحم گر ان کو آگیا قاصد
اور کے ہاتھ بھیجیں گے اب خط — تو نہ کہہ واں کا ماجرا قاصد
تیری باتوں پہ پیار آتا ہے — پھر کہو اس نے کیا کہا قاصد
یا یہ سلطانِ ہفت کشور ہے — یا یہ ہے میرے یار کا قاصد
خاک ہم ہو گئے وہاں خط کے — منتظر ہے، جواب کا قاصد
کیسی حسرت برستی منہ پر — خط جو لے کر اُدھر چلا قاصد

کیا تسلّی ہو کہتے ہیں تسکیںؔ!
واں سے دو دن میں آئیگا قاصد

(۴۸)

اس پہ جی سے گزر گئے شاید
نامہ بر جا کے مر گئے شاید

قاصد آتا نہیں خجالت سے
خط وہ لے کر مکر گئے شاید

آئی جو ماہتاب میں رونق
بام سے وہ اُتر گئے شاید

ہم کو اپنی خبر نہیں ہمدم
دیکھ تو آ کے مر گئے شاید

خندہ زن ہے ہر ایک زخمِ جگر
دل کے ناسُور بھر گئے شاید

دلِ خانہ خراب مرتا ہے
وہ نہیں اپنے گھر گئے شاید

کرتے ہیں ترکِ عاشقی تسکیںؔ
جاں نثاری سے ڈر گئے شاید

(۴۹)

رہتے ہیں یوں تو روز ہی ان کے کواڑ بند
کیا جانے آج کیا ہے جو کی ہے دراڑ بند

ہوتا نہ میرے ہاتھ لگانے سے گر غبار
تو باندھتے قبا کے نہ وہ چار چار بند

(۵۰)

جنسِ دل کی مرے کچھ قدر نہ ہو گی افسوس
تم وہ لیتے ہو کہ کر دیں جسے اغیار پسند

(۵۱)

دل جو بیں دینے لگا شب روئے جاناں دیکھکر
کیسی بل کھانے لگی زلفِ پریشاں دیکھکر
پھر چلے وہ ناز سے دامن اُٹھا کر، ہے ستم
کچھ نہ رحم آیا مرا حالِ پریشاں دیکھکر
خوب ہی اُس بت کے جلوے کا دیا دھوکا خدا
کیسے جھگڑے میں پڑے گبر و مسلماں دیکھکر
ہم صفیرو، رشک ہے عالم کو اپنی موت پر
ہم موئے چاک قفس سے کیا گلستاں دیکھکر
سب ہیں حاضر آؤ، دم کو، جو پسند آئے سو لو
جان و دل، صبر و تحمل، دین و ایماں، دیکھکر
تجھ کو بھی تابِ نظر میری طرح سے گر نہیں
آئنہ کیوں رکھ دیا، اے مہرِ تاباں دیکھکر
اے جنوں رخصت نہیں سر پھوڑنے کی ضعف سے
حسرت آتی ہے، در و دیوار زنداں دیکھکر
جی میں آتا ہے خدا سے کہیئے اپنا رازِ دل
عشق میں پردہ نشیں کے رازِ پنہاں دیکھکر

سادہ لوحی سے مجھے ہوتی ہے اُمید اثر
اور رہی دل میں وفورِ یاس وحرماں دیکھکر
یہ غضب کے تیر کب رُکتے ہیں تن تسکیں ہو تو
دل پہ مت رکھ ہاتھ میرے اپنے مژگاں دیکھکر

(۵۲)

ہوئے تھے بھاگ کے پردے میں تم نہاں کیوں کر
وہ پہلی وصل کی شب شوخیاں تھیں ہاں کیوں کر
فلک کو دیکھ کے کہتا ہوں جوشِ وحشت میں
الٰہی ٹھہرے مری آہ کا دھواں کیوں کر
تمھارے کوچے میں اس ناتواں کا تھا کیا کام
مجھے بھی سوچ ہے آیا ہوں میں یہاں کیوں کر
زباں ہے لذتِ بوسہ سے بند اے ظالم
مزہ بھرا ہے جو دل میں کروں بیاں کیوں کر
شبِ وصال سے شکوے ہزاروں ہیں جی میں
الٰہی بند رہے گی مری زباں کیوں کر
حذر ضرور ہے اب کی اثر سے دیکھو تم
اُٹھا لیا مری آہوں نے آسماں کیوں کر

(۵۳)

بات دو چار میں چھپی نہیں افشا ہو کر
کچھ میں کہنے کو ہوں سن لیجے تنہا ہو کر

(۵۴)

تجھ کو آنا ہی عیادت کو اگر اب بھی تو آ
پھر گیا احوال کو میرے مسیحا دیکھ کر

اس گلی میں اژدہام اغیار کا یاد آ گیا
دل میں جوش حسرت و یاس و تمنا دیکھ کر

دیکھنا شوخی یہ کہتے ہیں مرے دشمن سے وہ
کیا ہنسی آئی مجھے تسکیں کو روتا دیکھ کر

(۵۵)

گر مر کے چھٹے دل کی طپش سے تو عزیزو
تا حشر نہ نکلیں گے کبھی گور سے باہر

(۵۶)

اُس کو میں مجھ کو جانے سے کرتا ہی منع ہائے
ناصح کو کوئی جا کے کرے پاسبانِ غیر

(۵۷)

لگا جو دیکھنے اس چشمِ فتنہ گر کی طرف
تو اس نے غور سے دیکھا مری جگر کی طرف

(۵۸)

مرتے ہیں داغ دل سے عبث ہم نے کھائے گل
اس نے ہماری خاک پہ کس دن چڑھائے گل

دیکھی ہیں اُن سے غنچہ دہن کی نزاکتیں
میری نظر میں کیوں کہ الٰہی سمائے گل

وا شد کرے گی غنچے کی کیا شبنم و نسیم
ہے میرے آہ و نالہ سے نشو و نمائے گل

دیکھی ہیں رشکِ گل پہ تری جامہ زیبیاں — بے وجہ چاک چاک نہیں ہے قبائے گل

گلشن میں سیکڑوں پڑے رہتے ہیں خاک میں — تو نے ہی عندلیب ہیں سر پر چڑھائے گل

آیا جو یاد درد ترے دل کا اے نسیم — اپنے لیے نہ وصل میں ہم نے بچھائے گل

تزئین میری وصل میں بیدرد نے یہ کی — سینے کے داغ چھیل کے سارے بنائے گل

ہے دل بھی کیا متاع کہ لینے کے واسطے — گلشن نے عندلیب کو کیا کیا دکھائے گل

تسکیںؔ ہی خوش نصیب ہے الفت میں ورنہ یوں
چھاتی پہ عندلیب نے کس دن نہ کھائے گل

(۵۹)

اے شوقِ بوسہ اس کی تلاشِ دہن میں ہم — اتنا پھرے کہ کھوئے گئے ہیں وطن میں ہم

بھولے ہیں اپنے آپ کو فکرِ سخن میں ہم — عزت سخن سے پائیں نہ کیوں انجمن میں ہم

اس گل کی اے صبا ہمیں لادے ابھی خبر — جاتے ہیں ورنہ خاک اڑاتے چمن میں ہم

آتا ہے آپ رشک ہمیں اپنے حال پر — یکتا ہیں ایسے محنتِ رنج و محن میں ہم

ہر قطرہ مشک نافہ ہے سودے میں زلف کے
بیچیں گے اپنے خوں کو ختا و ختن میں ہم

(۶۰)

اس فکر میں مرتے ہیں شب و روز کہ کیونکر — دیکھیں گے تری شکل دمِ بازپسیں ہم

دیکھا ہے تمہیں خواب میں شب غیر سے ملتے — اب لاکھ قسم کھاؤ نہ لائیں گے یقیں ہم

(۶۱)

اے چشمِ سرمگیں تری گردش نے کیا کیا　　راحت پذیر تھے ستمِ آسماں سے ہم
طغیانِ بحرِ اشک ڈراتا ہے کس لیے　　بیزار آپ بیٹھے ہیں ساری جہاں سے ہم

(۶۲)

سراپا کا اس کے تماشا کریں　　جو قابو میں وہ ہو تو کیا کیا کریں
محبت میں کچھ نام پیدا کریں　　ذرا آپ کو ہم بھی رسوا کریں
بہت قدر و قیمت کی ہے جنسِ دل　　نگہ پر تری کیوں کہ سودا کریں
محبت میں ہوتا ہے آخر جنوں　　ابھی سے گریباں کو پھاڑا کریں
دکھاؤں گا میں اپنی دیوانگی　　پریشاں وہ زلفِ چلیپا کریں
چھٹیں رنجِ طاعت سے زاہد ابھی　　کرم پر گر اس کے بھروسا کریں

(۶۳)

باتیں عدو سے کرتے ہیں وہ اور دہاں نہیں　　حیرت سے میں خموش ہوں گویا زباں نہیں
یہ راست گو عدو کو سمجھتے ہیں عشق میں　　کرتے کسی طرح وہ مرا امتحاں نہیں
وہ پوچھتے ہیں وصل میں فرقت کا ماجرا　　یاں اب بھی ہے یہ حال کہ تابِ بیاں نہیں
قاصد ادھر گیا ہے ترے پیچھے دل مرا　　کچھ اس کی بھی خبر ہے کہاں ہے کہاں نہیں
کہتا ہوں حشر میں ترا دیدار دیکھ کر　　دونوں جہاں کو میں نے دیا رائیگاں نہیں
کب تک رہے گا دیکھیے انکار عشق سے　　تسکیں جو دل میں ہے ترے منہ پر عیاں نہیں

(۶۴)

شکوہ ظلم کی مجال نہیں / رحم معلوم جب کہ قال نہیں
اُن سے شکوہ کیا ستم کا ہائے / لُطف کے قابل اپنا حال نہیں
کبھی کہتا ہوں وصل مشکل ہے / کبھی کہتا ہوں کچھ محال نہیں
ہم کو یوں نیند آئی ہے گویا / صبح ہوگی شبِ وصال نہیں
خاک تدبیرِ مرگ کی کیجیے / ذہن کو بھی تو انتقال نہیں
کرے تحقیق کس نے کی چشمک / ابھی آنکھیں مری بحال نہیں
اس پہ مائل ہوں کیا کہوں تسکیںؔ
جس سے اک بات کی مجال نہیں

(۶۵)

کس لیے ضبط نہیں، صبر نہیں، خواب نہیں / گر مری جان کا خواہاں دلِ بیتاب نہیں
دیکھیے انعام تجھے اس کا ملا کیا قاصد / نامہ بے نام ہے سرنامے کا القاب نہیں
مجھ پہ بہتاں ہے تڑپنے کا سراسر تسکیںؔ
میرے پہلو میں بھی اب تو دلِ بیتاب نہیں

(۶۶)

ہر خار گو ہے دشت میں نشتر سے کم نہیں / ہوتا جنوں کا جوش مرے سر سے کم نہیں
گھبرا رہا ہوں آتے ہیں دیوار و در نظر / وحشت کا جوش دشت میں بھی گھر سے کم نہیں

قاصد نہ کر تو دیر کہ شکوہ پہ غیر کے
لکھیں گے وہ جواب میں وہ فن سے کم نہیں

اے چشمِ خوں فشاں نہیں کرنے کا ضبطِ اشک
ہر موے تن مرا مژۂ تر سے کم نہیں

روتی ہے خلق کہتے ہیں تسکیںؔ حالِ دل
ہنگامہ تیرے کوچہ میں محشر سے کم نہیں

(۶۷)

کیا کیا مزے سے رات کی عہدِ شباب میں
چھوڑوں نہ عمرِ رفتہ گر آ جائے خواب میں

اک دل کے واسطے یہ پھنسے وہ عذاب میں
رہتے ہیں اپنی زلف ہی کے پیچ و تاب میں

ہے شوقِ وصل تجھ سے لپٹتا ہوں بار بار
ورنہ یہ مستیاں تو نہیں تھیں شراب میں

اتنی نہ کیجیے جانے کی جلدی شبِ وصال
دیکھے ہیں میں نے کام بگڑتے شتاب میں

ہو جائے چاک سینہ کہ دل گھٹ کے مر چلا
اے چارہ جو کسی کو پھنسا مت عذاب میں

کر بحر و بر کی ہستیِ موہوم پر نظر
تھوڑی سی خاک ڈال دی چشمِ پُر آب میں

تب قتل گہ میں قتلِ عدو کو چلے ہیں وہ
میرا لہو ملا کے پیا جب شراب میں

کن منتوں سے وصل پہ راضی ہوئے ہیں وہ
سو نامہ بر ہوئے جو سوال و جواب میں

اختر شماریوں میں نکلتا ہے دم کہیں
تسکیںؔ تمھیں کو دخل نہیں ہے حساب میں

(۶۸)

سامانِ گریہ کیا ترے نالاں کے پاس ہیں
سو لختِ دل تو جنبشِ مژگاں کے پاس ہیں

دوزخ کو حسن سے ہنسا ہی جلنے کا ڈر مدام | وہ شعلے میری نالۂ سوزاں کے پاس ہیں
کھلتی ہو کوئی میری پریشانی کی گرہ | عقدے تمام کاکل پیچاں کے پاس ہیں
ہوجائے رحم اس کے نمکداں سے یہ کہو | ناسور بھی جراحتِ مژگاں کے پاس ہیں
طوفاں نوح کے جو سُنے غل ہیں آپ نے | وہ میری نیم جنبشِ مژگاں کے پاس ہیں

انگشتِ خار دستِ جنوں سے بھی ہے سوا
دامن کے چاک میرے گریباں کے پاس ہیں

(۶۹)

کچھ کہیں گے تو کہے گا تو سخن ساز ہمیں | بیوفا ہیں ترے معلوم سب انداز ہمیں
اٹھ گیا رشک سے دشمن، نہ اٹھا دو وہ کہیں | اپنی محفل کا سمجھ کر خلل انداز ہمیں
آشیاں شاخ پہ سدرہ کی بناتے اپنا | بے دماغی سے نہیں ہو سر پرواز ہمیں
بسکہ لگتے ہیں بُرے بے اثری کے طعنے | لیچلے سوئے فلک نالۂ دمساز ہمیں
ہو یقیں یہ کہ گرا کوئی نظر سے ان کی | آج کچھ اپنی نگاہوں میں ہے اعزاز ہمیں
اُس جفاجو کو چلا آئے مرا خط دے کر | نامہ بر ہی نہیں ملتا کوئی جانباز ہمیں

اپنی جانب سے نہ بن دیکھے ہیں اس پر عاشق
جانتی خلق ہے تسکین نظر باز ہمیں

(۷۰)

کیا کہوں میں تجھ سے ہمدم نامہ بر پر کیا بنی | جو خبر لائے ہیں وہ اس سی بیخبر سے آئے ہیں

وصل کی شب آج بھر ہے تو لیو ٹک کر ذرا
کہنے ہم گلشن میں یہ مرغِ سحر سے آئے ہیں

میری خاطر سے ہوئی ہے اسکی حالت بھی تباہ
لوگ اس کوچے میں مل کر نامہ بر سے آئے ہیں

اتنی جلدی آئی کیونکر یہ شبِ ہجراں خدا
ہم ابھی تو مل کے اس رشکِ قمر سے آئے ہیں

وائے قسمت لا کے دی خط کا یہی قاصد جواب
وہ مرے جانے سے پہلے اپنے گھر سے آئے ہیں

اپنی محفل میں بلاتے ہو تو دو سب کو جواب
تا نہ پوچھے کوئی یہ صاحب کدھر سے آئے ہیں

مل گیا شاید کوئی غارت گرِ دل راہ میں
آپ کچھ بیتاب تسکیں اپنے گھر سے آئے ہیں

(۷۱)

زلفِ پر پیچ کو کھولا ہے یہ کس نے یارب
کہ مرے پاؤں کی زنجیر کسے دیتے ہیں

ایسی ہے غیر کی خاطر کہ مرے حال کو سن
دل میں روتے ہیں یہ ظاہر میں ہنسے دیتے ہیں

(۷۲)

کیوں جھجکتا تھا گلے ملنے میں وہ
نشے میں شب میں نے پوچھا کچھ نہیں

میری حالت دیکھ کر شرمائے کیا
اس سے ظاہر ہے کہ دیکھا کچھ نہیں

تم نے تسکیں دل دیا تو کیا ہوا
جان کی بھی واں تو پروا کچھ نہیں

(۷۳)

میرے اشکِ گرم سے روشن ہے گلخن آب میں
جل رہی ہیں مردمِ آبی کے مسکن آب میں

اس صنم سے کیا لبِ دریا ہوا اپنا ملاپ ۔۔۔ جل مرا اس رشک سے ہر اک برہمن آب میں
یاد میں اس گل کی دریا باغ میں طوفاں ہوا ۔۔۔ بھرتے ہیں جوں مرغِ آبی مرغِ گلشن آب میں
عکس ثریا دُر مسی مالیدہ لب کا نہر میں ۔۔۔ مچھلیاں بھی دیکھ لیں گلبرگ سوسن آب میں

اشک سرخ آنکھوں میں آئے روتے روتے دیکھنا
لعل کے اشک تُنے بھیجے کس نے معدن آب میں

(۷۴)

باتوں ہی کے مشفق ہیں مری حضرتِ ناصح ۔۔۔ دو دن تو رہیں پاس مرے رنج و محن میں
قاصد تو خبرداری سے لیجائیو اگر واں ۔۔۔ رکھ دوں میں دلِ زار کو نامے کی شکن میں

(۷۵)

سو غنچہ تنگ ہو یہ کہاں وہ دہن کہاں ۔۔۔ گو برگِ گل سے لب ہوں مسی کی پھبن کہاں
اس رشکِ گل کی بو کو نہ لے آئی ہو کہیں ۔۔۔ جاتی ہے بہکی بہکی نسیمِ چمن کہاں
اب چپکے بیٹھے سنتے ہیں ناصح کی گفتگو ۔۔۔ وہ ولولہ کہاں ہے وہ دیوانہ پن کہاں
برہم یہ آج ہونے لگا دل کا حال کیوں ۔۔۔ آئی نظر وہ زلف شکن در شکن کہاں
یاں سادگی سے ہے مجھے دشنام کی ہوس ۔۔۔ تنگی سے اس دہن میں ہی جائے سخن کہاں
سر پر جنوں نے لاش اٹھائی ہے بعد مرگ ۔۔۔ ملتا ہے مجھ کو دیکھیے گور و کفن کہاں

روتا ہوں، تم پہ جب نہیں چلتا ہے بس مرا
آتے ہیں مجھ کو آپ کے سے مکر و فن کہاں

(۷۶)

یاں انتظار ہی میں کٹی ہمکو ساری رات　　وان وعدہ کیا کیا ہوا انھیں یاد ہی نہیں

(۷۷)

ایک سے گزرے نہ دو دن کبھی تیری ہاتھوں　　چین تجھ کو بھی ذرا گردش ایام نہیں

بوسے آئینہ کا دینے لگو گے آپ ہی　　ابھی صاحب یہ کھلی لذت دشنام نہیں

(۷۸)

روئیں گے یاد کر کے ستموں کو بہشت میں　　زاہد وہاں کی حوروں میں جور و ستم نہیں

(۷۹)

کھلے اس بدزباں پہ گر محبت　　تو حرف ناسزا اور میں ہوں
نہ چھوٹی ہاتھا پائی غیر سے گر　　تو پھر دست دعا ہے اور میں ہوں
گزرتی ہے مزے سے اب تو تسکیں
کہ وہ شیریں ادا ہے اور میں ہوں

(۸۰)

روتی ہے مجھ کو ڈبو کے چشم تر کو کیا کہوں　　وہ ہی آنا تھا پسند اپنی نظر کو کیا کروں
خط مرا اس کو دیا ہے جا کے گھر میں غیر کے
عقل یاں حیراں ہے تسکیں نامہ بر کو کیا کہوں

(۸۱)

بے دورِ بادہ گردشِ دوراں کو کیا کروں
مخمور ہوں میں ساغرِ واژوں کو کیا کروں

لیتے ہی نام یار، مرے جی پہ آ بنی
ہمدم تسلیٔ دلِ محزوں کو کیا کروں

ملنے کو مجھ سے کہہ کے عدو سے وہ مل گیا
کہیے تو اپنے طالعِ واژوں کو کیا کروں

آنکھوں سے میری گر گئی میزانِ روزِ حشر
واعظ خیالِ قامتِ موزوں کو کیا کروں

مٹتا نشاں نہ گور کا گردوں سے بھی مٹے
ہاں تیری ترکتازیِ گلگوں کو کیا کروں

اٹھتا نہیں ہے کوچۂ دلدار سے قدم
تسکیںؔ میں رہنمائیِ مجنوں کو کیا کروں

(۸۲)

کہتا ہوں لاکھ طرح اسے مبتلا کروں
شاعر ہوں جو کہ چاہوں وہی ادّعا کروں

چھیڑوں ہزار طرح سے تم کو خفا کروں
قابو میں میرے دل ہو تو کیا جانے کیا کروں

ہونٹوں پہ جان آئے ہے افراطِ شوق سے
کیا شرحِ لذتِ لبِ معجز نما کروں

(۸۳)

ابھی چھوڑ دوں گا اسی طرح سے تم
یہ کہہ لو کہ ہے ہے خدا کیا کروں

(۸۴)

بے مہر کہتے ہو اسے جو بے وفا نہیں
سچ ہے کہ بیوفا ہوں میں تم بیوفا نہیں

عقدہ جو دل میں ہو گئے ہونے کا وا نہیں
جبتک کہ آپ کھولتے زلفِ دوتا نہیں

عیّاری دیکھنا، جو گئے ملنے کو کہو
کہتا ہے میں تو تم سے ہوا کچھ خفا نہیں

اشکوں کے ساتھ قطرۂ خوں تھا نکل گیا
سینے میں سو تو دل کو کوئی لے گیا نہیں

جلتا ہے سادہ لوحی پہ کیا اپنی جی مرا
دل لیکے اب جو بات وہ کرتا ذرا نہیں

وہ پُر خطر ہے وادیِ اُلفت کہ راہ میں
کہتے ہیں خضر ہائے کوئی رہنما نہیں

کرتا ہوں تیری زُلف سے دل کا مبادلہ
ہر چند جانتا ہوں یہ سودا برا نہیں

کیسے وہ تلخ تر ہیں مرے شورِ عشق سے
قسمت سے اپنا چاہنے میں بھی مزا نہیں

جوشِ جنوں میں سر پہ اُڑائیں کہاں کی خاک
دل کیا گیا غبار ہی جی میں رہا نہیں

دیکھوں لوے ہے جان ملک الموت کس طرح
تم وقتِ مرگ پاس سے اُٹھنا ذرا نہیں

تسکیںؔ نے نام لے کے ترا وقت مرگ آہ!
کیا جانے کیا کہا تھا کسی نے سُنا نہیں

۸۵

میں نے رکھا جو پاؤں پر سر کو
بولے وہ ناز سے کہ بس سر کو

دھوم ہے میری سخت جانی کی
تیز کر لو تم اپنے خنجر کو

جان کرتا ہے اک غلام نثار
کچھ خبر بھی ہے بندہ پرور کو

کام بلبل کا خاک نکلے گا
دل میں گُل کے جگہ ہوئی زر کو

میں وہی ہوں دیا تھا جس نے دل
تم وہی ہو اُٹھاؤ تو سر کو

جیسے ہم بیٹھکر اُٹھے تسکیںؔ
سب یونہی واں سے آئیں گے گھر کو

(۸۶)

ممکن نہیں جو ضبط قلق کا اثر نہ ہو
گذری جو ہم پہ شب تمھیں اسکی خبر نہ ہو

کس نے کہا کہ ہے اُسے دشمن سے دوستی
میرا ہی وہم ہے مرے جی کا ضرر نہ ہو

اے چشم اشکبار ذرا دیکھنے تو دے
ہوتا ہے جو خراب وہ میرا ہی گھر نہ ہو

کچھ اس سوا دشمنی تو نہیں اے دل حزیں
بے صرفہ نالہ کرنے سے ٹکڑے جگر نہ ہو

آتی ہے اپنے خط سے مجھے صاف بوئے خوں
جاتے ہی واں شہید مرا نامہ بر نہ ہو

یہ آرزو ہے جائے ذرا تجھ سے پہلے جاں
کہتا ہے کون وصل کی شب میں سحر نہ ہو

کیا کام مجھ کو غیر سے ناصح سے کیا غرض
جھگڑا ہی کچھ نہ ہو تری اُلفت اگر نہ ہو

آرام سے بغل میں وہ بیٹھیں کوئی گھڑی
تسکیں جو اضطراب تجھے اس قدر نہ ہو

(۸۷)

خجل ہے زلف معنبر سے مشکناب کی بو
ترے بدن پہ تصدق ہوئی گلاب کی بو

خدا کرے کہ غلط ہو جو وہم ہے جی کو
بُری لگی ہے تمھیں سینے میں کباب کی بو

طرح طرح سے بُرا اس کو کہتے ہیں واعظ
سنگھا دُونگا کبھی حضرت کو میں شراب کی بو

گیا ہے جب سے ترے در کو چھوڑ کر تسکیں
نہ آئی پھر ہمیں اس خانماں خراب کی بو

(۸۸)

کیسی سج دھج بنائے جاتے ہو | کیا کسی کے بلائے جاتے ہو
آنکھ پڑتی ہے بزم میں سب کی | تم نظر میں سمائے جاتے ہو
پھر مزے یاد کر کے روؤں گا | کیوں مجھے تم ہنسائے جاتے ہو
کیوں نہ ہوں بدگمانیاں مجھ کو | تم بھی تو آزمائے جاتے ہو
اس کی محفل سے سچ کہو تسکیںؔ | کس لیے تم اٹھائے جاتے ہو

(۸۹)

دل یہ کہتا ہے قفس میں کبھی فریاد نہ ہو | تا اسیروں سے گراں خاطرِ صیاد نہ ہو
ناتواں وہ ہوں بصد زور اگر سینے سے | لب تلک نالہ کبھی آئے تو فریاد نہ ہو
کر دیا وہ الم ہجر نے مایوس نوید | گر سنوں بھی کہ تو آتا ہے تو جی شاد نہ ہو
یہ تو سچ ہے کہ جو تم چاہو گے کر گزرو گے | پر یہ ممکن نہیں ہم پر کبھی بیداد نہ ہو

(۹۰)

اک اک سے کہہ چکا ہوں ستم اسکے قہر ہیں | اس پر بھی اسکی غیر کو الفت ہوئی تو ہو
اس بت کیواسطے ہی خدا سے بگاڑ دی | ناصح اگر عدو سے عداوت ہوئی تو ہو
بن آئے یار کے نہیں اٹھنے کا گور سے | کہہ دو کوئی خدا سے قیامت ہوئی تو ہو
جاتی ہے جان یار سے ملنا ضرور ہے | تسکیںؔ اگر ستم کی ندامت ہوئی تو ہو

(۹۲)

ہمارے زخمِ دل میں چاہیے المـاس بھر دینا — نمک پاشی کی عادت ہوگئی اسکے نمکداں کو
بہت ہے اپنی تابش پر اسے اے مہر وش دعوے — ذرا منھ کھول کر اپنا دکھا دے مہرِ تاباں کو
ترے کوچے کی آتش اگر ایسی کوئی کہہ دے — جہنم کی طرح جنت جلا دے پھر تو رضواں کو
ہمیں دیتا ہے آنے کوچہ سفاک میں تسکیں — کہوں کیونکر نہیں مجھ سے محبت اسکو درباں کو

(۹۲)

وہم آتا ہے مٹا کر خطِ پیشانی ہائے — [illegible] لکھا ہوا اس در کی جبیں سائی کو
لاکھ عشق کے سے ہنگامے کیے ہم نے بپا — موت اس پر بھی نہ آئی شبِ تنہائی کو
امتحاں غیر کی الفت کا ہوا ہے شاید — چھوڑ بیٹھے ہیں وہ تزئین خود آرائی کو
میری آزار کی لے لے نہ اجازت دشمن — اس پری وش کو دکھا کر کسی سودائی کو

(۹۳)

مجھ بیگنہ کے قتل پہ گر ہے خوشیِ غیر — ظالم تو میرے واسطے اندوہگیں نہ ہو

(۹۴)

آتے ہی ان کے جان گئی واہ رے نصیب — نکلی جو آرزو تو دمِ واپسیں کے ساتھ

(۹۵)

تھے جن سے گمان دوستی کے — دشمن وہ ہوئے ہمارے جی کے
ارمان بھی نہ نکلے آہ جی کے — کیا لطف اٹھائے عاشقی کے
اک خلق ہے تلخ کام، سُن کر — کیا شور ہیں اپنی بے کسی کے

سچ ہے تمھیں کیا وفا سے مطلب
معشوق نہیں ہوئے کسی کے

کیا تجھ سا دکھا دیا ہے بدخو
کیوں ٹکڑے کیے ہیں آرسی کے

کیا عشقِ عدو ہوس ہے، سچ ہے
سب قول غلط ہیں مدعی کے

دل دینے کی قتل ہی سزا ہے
قائل ہیں تمھاری منصفی کے

کیا رفع یدین عشق تجھ سے
ہیں کانوں پہ ہاتھ شافعی کے

دی عقل خدا نے جن کو ناصح
دیوانے ہوئے وہ اس پری کے

ہے جنّ و پری ملک سے بہتر
گو ڈھنگ برے ہیں آدمی کے

تسکیںؔ نے چوسے ہیں شکر لب
بوسے ترے آج سب ہیں پھیکے

(۹۶)

فرق کچھ تو چاہیے اغیار سے
سرِّ الفت ہم چھپائیں یار سے

اپنی آنکھوں سے اگر تشبیہ دوں
اشک ٹپکے روزنِ دیوار سے

بات ان کی معتبر ہے سچ کہا
حال میرا پوچھیے اغیار سے

اس کی چوٹی میں نہیں ہو باف سرخ
اٹھتے ہیں شعلے دہانِ مار سے

دھوپ میں بیٹھوں کہ خجلت سے عدو
بھاگ جائیں سایۂ دیوار سے

پاس سے تیرے اٹھاتی غیر کو
زور ہو سکتا جو چشمِ زار سے

چھوٹتی ہیں منھ پہ کیا مہتابیاں
وصل کے دن سایۂ دلدار سے

سو طرح کی فکر میں تسکیںؔ پڑے
دل لگا کر اس بتِ عیار سے

(۹۷)

یوں چاہے کوئی سدِ سکندر میں گھر کرے
مشکل یہ ہے جو کوچۂ دلبر میں گھر کرے

اے دل یہ خاک میں ترا ملنا ہے بے اثر
وہ کر جو اس کی طبعِ مکدر میں گھر کرے

وہ میکدہ نشیں ہوں کہ ہو جاؤں خاک گر
میرا غبار بھی خطِ ساغر میں گھر کرے

دل چاک چاک ہے مرا اس واسطے کہ یہ
شانے کی طرح زلفِ معنبر میں گھر کرے

سودے کو دو جہان کے کرتا ہوں سر سے دور
تیرا خیال تاکہ مرے سر میں گھر کرے

بیتابیوں کی اور ہوس ہو تو آن کر
سیماب سے کہو دلِ مضطر میں گھر کرے

اس بت کو کچھ اثر ہی نہ ہووے تو کیا کروں
تسکیں یہ آہ وہ ہے کہ پتھر میں گھر کرے

(۹۸)

تجھ سے انداز میں ہونے جو مقابل آئے
اس سے کہہ پہلے وہ تسکین سے بسمل آئے

جی میں آتا ہے کہ ضد سے تری دیدیں ناصح
دل تو دل جان بھی لینے جو وہ قاتل آئے

کٹ گئی ہجر کی شب آہ و فغاں سے سچ ہے
یار کام آتے ہیں جس دم کوئی مشکل آئے

زلف کس شوق سے اس بت کی تھی جکڑی تسکیں
آپ جنت میں جو پابندِ سلاسل آئے

(۹۹)

خط بھیجنے کا قصد کوئی واں اگر کرے
تو پہلے چارۂ نظرِ نامہ بر کرے

صبحِ شبِ فراق سے جاتی ہے پہلے جاں
کیا نالہ میرے حال پہ مرغِ سحر کرے

آتی ہیں یاد گردشیں اس چشمِ مست کی
ساغر کا دَور مجھ کو نہ دورانِ سر کرے

تسکیںؔ کسی کے واسطے مرتا ہے ہمنشیں
کوئی کسی کو جا کے بس اتنی خبر کرے

(۱۰۰)

دل کس کی تیغِ ناز سے لذت چشیدہ ہے
ہر زخم شوق سے لب حسرت گزیدہ ہے

اس گرم اضطراب سے دل جل گیا خدا
پہلو میں میرے دل ہے کہ برقِ طپیدہ ہے

چوساد ہانِ زخم نے اس کو ہے اس طرح
پیکانِ تیر یار زبان مکیدہ ہے

ناصح جنوں کی بخیہ گری کی ہوس نہیں
ہر تار جیب اب تو گریباں دریدہ ہے

غنچہ کی طرح خاک رکھیں سر کو باندھ کر
جوں بوئے گل یہاں سے تو جانا جریدہ ہے

کچھ آج زلزلہ سا زمیں کو ہے گور میں
تسکینِ بے قرار مگر آرمیدہ ہے

(۱۰۱)

مرتا ہوں میں جتنا وہ سمجھتا ہے ہنسی ہے
یہ کیسی خرابی ہیں مری جان پھنسی ہے

(۱۰۲)

طبیعت بس گئی جس پر حنا کی
وہ رنگت ہے تمھارے دست و پا کی

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

(۱۰۳)

اللہ رے آرزو ترے ملنے کی بعدِ مرگ
حسرت ٹپکتی ہے مری شمعِ مزار سے

(۱۰۴)

تو کیوں پاس سے اُٹھ چلا بیٹھے بیٹھے
ہوا تجھ کو کیا بے وفا بیٹھے بیٹھے

گنہ گار میں ہو گیا بیٹھے بیٹھے
کیا تو نے یہ ہائے کیا بیٹھے بیٹھے

کہاں تک کروں ضبطِ نالہ کہ پوچھو
مرے جی میں آتا ہے کیا بیٹھے بیٹھے

نہ پہنچے پس مرگ بھی گور تک ہم
رہے پاؤں چلنے سے کیا بیٹھے بیٹھے

وہ آئے تبھی آتے رہے پر تعلق سے
مرا کام ہی ہو گیا بیٹھے بیٹھے

اٹھاتے ہو کیوں اپنی محفل سے مجھ کو
لیا میں نے کیا آپ کا بیٹھے بیٹھے

کریں سعی کچھ اُٹھ کے اس کو سے اے دل
یہ حاصل ہوا مدعا بیٹھے بیٹھے

وہ اس لطف سے گالیاں دے گئے ہیں
کیا کرتے ہیں ہم دعا بیٹھے بیٹھے

ذرا گھر سے باہر نکل، مان کہنا
نہ ہوگا کوئی مبتلا بیٹھے بیٹھے

نہ اٹھا گیا دل کے ہاتھوں سے تسکیںؔ
کہا اس نے جو سب سنا بیٹھے بیٹھے

(۱۰۵)

دل تو وہ زلفِ دوتا مانگے ہے
مانگ آپ دیکھیے کیا مانگے ہے

اب یہ حالت ہے کہ ان سا بے درد
میرے بچنے کی دعا مانگے ہے

دل نہ دوں تو میں کیا کروں تسکیںؔ
دل پری ہوش ربا مانگے ہے

(۱۰۶)

کچھ جی جانے ہے ناصح تو ڈرا جاتا ہے
یہی جاتا ہے محبت میں تو کیا جاتا ہے

دل کے جاتے ہی چلی جان یہ جلدی کہ نہ پوچھ
صبر بھی چند قدم پیچھے رہا جاتا ہے

(۱۰۷)

بدنام ہو کے عشق میں ہم نام سے گئے — کس کام کے ہوئے کہ سبھی کام سے گئے

میراہی انتظار نہ ہووے کہ کہتے ہیں — وہ آکے جھانک جھانک لبِ بام سے گئے

(۱۰۸)

میں نے وہ ہم عشق سے واعظ کی آنکھیں لیں نکال — دیکھ کر اس بت کو روتا تھا وہ ایماں کیلئے

میں نے ٹکرا کے وحشت میں کئی ہیں کوہ خاک — تاہم پتھر نہ ہوں بنیادِ زنداں کیلئے

(۱۰۹)

جھڑکیاں کھا کے آئیں گے واں سے — ہمنشیں کیا کہیں گے درباں سے

نہیں کھلتا کہ لائے گا قاصد — کیا خبر اب کی کوئے جاناں سے

حال اس بے وفا سے کہتے ہم — ہوتی فرصت جو عہد و پیماں سے

اپنے مجنوں کی شورشیں دیکھو — کھول کر عقدہ زلفِ پیچاں سے

گل سے آئی تھی کہنے کس کا حال — کیوں صبا پھر چلی گلستاں سے

(۱۱۰)

تسکیں مجھے اس سر کی قسم کچھ نہیں معلوم — کیا کرتے ہیں الفت کے لیے کیا نہیں کرتے

(۱۱۱)

کر سکے دفن نہ اس کو ہیں جو احباب مجھے — خاک میں دل کی کدورت نے دیا داب مجھے

قاصد آیا ہے وہاں سے تو ذرا تھم تو سہی — بات تو کرنے دے اس سے اے دلِ بیتاب مجھے

ہجر میں پاس ہے زہر نہ خنجر افسوس — نہ دیے موت کے بھی چرخ نے اسباب مجھے
چاند کے خواب میں آنے سے بھی ڈر جاتا ہوں — ہجر میں گذری ہے گویا شب مہتاب مجھے
نام تسکین و یہ مضمونِ طپش نازیبا
تھا تخلص جو سزاوار تو بے تاب مجھے

(۱۱۲)

ہجر بھی ہو تو مزہ وصل کا حاصل ہووے — آنکھ کے آگے وہی شکل و شمائل ہووے
آتش عشق جلا دے تری اُلفت کے سوا — اور کچھ دل میں جو اندیشۂ باطل ہووے
حلقے اس زلف کے بے لاتو بنا کر ناصح — مجھ سا دیوانہ جو پابندِ سلاسل ہووے
مجھ پہ موقوف نہیں دیجیو دشنام اس کو — ایک جو بوسۂ لب کا ترے سائل ہووے
وہم تسکیں کو شب تار میں یہ ہے کہ کہیں
سوئے دشمن، نہ گیا، وہ مہ کامل ہووے

(۱۱۳)

نہ ہاتھ آتے یہ گوہر پئے نثار مجھے — بھلا ہوا کہ ملی چشم اشکبار مجھے
ہزار طرح سے کرنی پڑی تسلّیِ دل — کسی کے جلنے سے گو خود نہیں قرار مجھے
نکلی حسرتِ دل کیا کہ ایک شب تم نے — دیا نہ اپنے سراپا کا اختیار مجھے
شب وصال میں سُننا پڑا افسانہ غیر — سمجھتے کاش وہ اپنا نہ راز دار مجھے
وہ اپنے وعدہ پہ محشر میں جلوہ فرما ہیں — نہیں ہے ضعف سے انبوہ میں گزار مجھے

گلے لگاؤ نگا کس لطف سے وصال تو ہو — بنا رکھیں گے وہ اپنا گلے کا ہار مجھے
کروں گا داورِ محشر سے ستم کی پھر فریاد — اب آگیا ہے اسے دیکھ کر پیار مجھے
مرے قفس میں عجب ہے نہ گل کھلا کوئی — سنا گئی تھی صبا مژدۂ بہار مجھے
مرے قصور سے دیدار میں ہوئی تاخیر — نہ دیکھنا تھا تماشائے روزگار مجھے
ترے ستم کے بیاں میں اگر یہی ہے مزہ — پڑے گا حشر میں کہنا ہزار بار مجھے
عذابِ گور ہوئیں بدگمانیاں پسِ مرگ — بنانا تھا اسی دروازے پر مزار مجھے
بھرا ہوا ہے جو دل میں بیاں کروں کیونکر — نہیں تمہاری محبت پہ اعتبار مجھے
سیا تھا میرے گریباں کو کس لیے ناصح — تمہاری جیب کو کرنا تھا تار تار مجھے
وہ میری گریہ کا ہنس ہنس کے پوچھتے ہیں سبب — دکھائے دیکھئے کیا چشمِ اشکبار مجھے

مزے یہ دیکھے ہیں آغازِ عشق میں تسکیںؔ
کہ سوجھتا نہیں اپنا مآلِ کار مجھے

(۱۱۳)

تمہیں اغیار ہیں دیکھو تو کیسا باوفا سمجھے — مجھے کہتے ہیں کیا دیکھا جو اس کو آشنا سمجھے
کہا جو تم پہ مرتا ہوں تو بولے یہ کہ مر جاؤ — کہا کیا ان سے میں نے اور وہ کیا میرا کہا سمجھے
نہیں اس کا بھروسہ یہ ہی ہوگا غیر کہتے ہیں — ستم ہیں اپنے جس دن ہائے وہ کچھ بھی مزا سمجھے

علاج اس سادگی کا پہلے کرنا چاہیے تسکیںؔ
کہ ہم ان سے وفا دشمن کو اپنا آشنا سمجھے

(۱۱۵)

ہوش اتنا مجھے وحشت میں کہاں رہتا ہے
کس کا یہ نام ہے جو ورد زباں رہتا ہے

کب مزہ خنجر قاتل میں نہاں رہتا ہے
ہر لب زخم سے حسرت کا بیاں رہتا ہے

غش سے اک آن افاقہ نہیں ہوتا مجھ کو
اس کے آنے کا جو بالیں پہ گماں رہتا ہے

عشق اور حسن میں ہے ربط ستم مجھ پہ ہے
جوں جوں میں اس کو چھپاؤں وہ نہاں رہتا ہے

ہے یہ ممکن کہ یقیں آئے اسے الفت غیر
بدگمانی سے مگر مجھ کو گماں رہتا ہے

دھیان بھی زلف کے پیچوں کا برا ہوتا ہے
دل جو گھٹتا ہے تو پھر دوں خفقاں رہتا ہے

جس پہ مرتا ہوں خبر اس کو نہیں ہے افسوس
عشق معشوق کا پردہ میں نہاں رہتا ہے

ناز سے کہتے ہیں مجھ سے یہ تسکیں بتلا
آئینہ کیوں مری جانب نگراں رہتا ہے

(۱۱۶)

مرے دل پر بنی سوز نہاں سے
کہاں ہے موت ہم مرتے ہیں جاں سے

خدا جانے عدو پر کیا بنے گی
پڑا ہے کام اُن سے بدگماں سے

گماں ہے دل کو سب پر نامہ بر کا
کہوں کس کس سے آتے ہو کہاں سے

کہیں ایسا نہ ہو کہہ دے مفصل
کیا ہے شکوہ ان کے رازداں سے

میں وہ ہوں ناتواں طالع کو اپنے
جگا سکتا نہیں خواب گراں سے

دکھاؤ رنگ اپنے دل کا تسکیں
اٹھاؤ ہاتھ چشم خوں فشاں سے

بنا تسکیں نہ وہ بُت دوست اپنا
بگاڑی کس لیے سارے جہاں سے

(۱۱۷)

دستِ پا اپنے جنوں میں نہیں کہنا کرتے
ورنہ ہم خانۂ زنجیر کو صحرا کرتے

آرزو بھی ہمیں اُس بُت کی خدا، سو نہ ملا
اور کس چیز کی ہم تجھ سے تمنا کرتے

یہ نہ کہنا کہ شبِ وصل میں کیا ہوتا ہے
ہائے گر ایک بھی وعدے کو وہ ایفا کرتے

بادہ خواری نے کیا ہے مرا وہ حال خراب
کہ مُغاں بھی ہیں مجھے دیکھ کے توبہ کرتے

کیا یہ کہتے ہو گی دل کی بُری ہوتی ہے
تم سمجھتے تو مجھے یوں نہ ستایا کرتے

(۱۱۸)

گر میرے بیٹھنے سے وہ آزار کھینچتے
تو اپنے در کی آکے وہ دیوار کھینچتے

ناز و ادا و غمزہ سے یوں دل لیا مرا
لیجائیں جیسے مست کو ہشیار کھینچتے

وا حسرتا ہوئی انھیں آنے کی تب خبر
لائے جب اس گلی میں مجھے یار کھینچتے

آئیگا ان کے کہنے سے وہ گل یہاں تلک
کانوں میں یہ کیوں ہیں اب مجھے اغیار کھینچتے

وہاں شوق جالیوں کا ہے اس جامہ زیب کو
یہاں اپنے پیرہن سے ہیں ہم تار کھینچتے

تیغ نگاہِ یار اُچٹتی لگی ہے پھیر
برسوں گزر گئے مجھے آزار کھینچتے

کہتے ہیں شب وہ کہتے تھے آتا ہی جی گھٹا
نالے جو ہم رہے پسِ دیوار کھینچتے

آزردہ ان کو دیکھتے ہی جان نکل گئی
وہ دیکھ مجھ کو رہ گئے تلوار کھینچتے

تسکیںؔ کا چاک چاک ہوا دل، جو شانے کو
دیکھا کسی کا طرۂ طرار کھینچے!

(۱۱۹)

تم غیر سے ملو نہ ملو میں تو چھوڑ دوں ——— گر اس وفا پہ کوئی کہے بے وفا مجھے
سچ ہے تو بدگماں ہو سمجھتا ہے کچھ کا کچھ ——— بوسہ نہ لینا تھا ترے آئینے کا مجھے
انصاف کر خراب نہ پھرتا میں دربدر ——— ملتی جو تیرے گوشۂ خاطر میں جا مجھے
اس بُت کی میں دکھاؤں نگا نعوذ باللہ واعظو ——— پھر کیا کہے گا داورِ روزِ جزا مجھے
کیوں اُن سے وقتِ قتل کیا شکوہ غیر کا ——— کرنی تھی مغفرت ہی کی اپنی دعا مجھے
پوچھے جو تجھ سے کوئی کہ تسکیںؔ سے کیوں ملا
کہہ دیجو حال دیکھ کے رحم آگیا مجھے

(۱۲۰)

رات اس بزم میں غیر دنکی بن آئی ہوتی ——— میں نے گر مرے کی صورت نہ بنائی ہوتی
دل میں دشمن کے ٹھکانا نہ کرے ڈرتا ہوں ——— اب نہیں جی میں مری غم کی سمائی ہوتی
دل جو لینا ہی تو لو سوچتے کیا ہو پیارے ——— دوستوں میں نہیں چیز پرائی ہوتی

(۱۲۱)

گھبرا کے نہ سم کھاؤں جلدی سے نہ مر جاؤں ——— سب کہتے ہیں کام اچھا تاخیر میں ہوتا ہے

(۱۲۲)

نہ دیکھا ہمنے یوں پھرتے کسی کو کوئے دلبر سے
بنی کیا جی پہ تسکیں کیوں چلے آتے ہو مضطر سے

یہ اکثر وہم آتا ہے گرا نامہ کبوتر سے
کبوتر پر بندھا نامہ تھا نہیں سنتا ہوں اکثر سے

کیا بدنام اس کو عشق میں مجھ سے نہ یہ پوچھا
کہ ہم واقف تھے کچھ بھی ساکنانِ کوئے دلبر سے

ہنسی میں اس کے دانتوں کی چمک نے یہ کیا بیخود
ملائے خاک میں آنکھوں نے آنسو تھے جو گوہر سے

دعائے دشت کی ہو کی ترے مجنوں نے زنداں میں
صدائے الاماں کانوں میں آتی ہے جو گھر سے

نہ پوچھ اس شوخ کے وصل کی شب کا سماں مطرب
صدائے نغمہ آتی ہے مجھے ہر تارِ بستر سے

تمہارے تیرِ مژگاں نے کیے ہیں دل کے سو ٹکڑے
نہ مانو گر دکھاؤں چیر پہلو نوکِ خنجر سے

جوابِ نامہ تو اس کا پھریگا لیکے جب قاصد
خبر کچھ رنجشوں کی لائیو دشمن کے بھی گھر سے

جوابِ تلخ نے اس بت کے کھوئے ہوش کیا تسکیں
کہو کچھ تم بھی ہو شیریں زباں بیٹھے ہو چپ سے

(۱۲۳)

کہہ دو صبا سے رہے گا کون
گر نظر بھی سوئے قفس نہ رہی

(۱۲۴)

چاہوں خدا سے داد کو کیونکہ کیا تمام
روزِ حساب میرے غمِ بے حساب نے

ایسا کہا کچھ اس نے کہ دیوانہ بن گیا
قاصد کی جان لی مرے خط کے جواب نے

یاد آگیا وہ عارضِ گلرنگ چارہ جو
لے اور غش کیا مجھے بوئے گلاب نے

(۱۲۵)

تازیانہ شبِ غم تھا تری شوخی کا خیال — جانِ بیتاب کی خاطر دلِ مضطر کے لیے

یادِ دنداں میں ترے رونے کا کیا تار بندھا — غوطے دریا میں لگانے لگے گوہر کے لیے

ہاتھ تھک جانے کا ڈر تھا ترے ہم کو ظالم — اس لیے ہم نے نہ بوسے ترے خنجر کے لیے

فکرِ تنہائی نے مارا کہ مرے پاس یہی — شورِ الفت ہو سو لیجائیں گے محشر کے لیے

گھس گئے ہائے غمِ تنگیٔ مدفن میں ایسے — روزنِ مو ہے مدفن تنِ لاغر کے لیے

خونچکاں ہیں ترے دیواں کے مضامیں تسکیں
رشتۂ جانِ عدو چاہیے مسطر کے لیے

(۱۲۶)

دیکھ کر رُخ کی چمک پڑ گئے سر غش آیا نہیں — مر گیا ہوں شوق سے چلمن اُٹھا کر دیکھیے

پوچھیے کیا ہو سدا ہو گی قیامت کس طرح — خواب میں آجایئے مجھ کو جگا کر دیکھیے

آج اس کوچے میں تسکیں بجتا پھرتا ہے دل
بیجرا اچھی ہے، ذرا اس کو منگا کر دیکھیے

(۱۲۸)

دو بھی عالم میں کبھی ایک ہی دیکھے نہ گئے — ایک کو ایک سے، اک بات سوا آتی ہے

ایک ہم ہیں کہ دیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ — ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے

(۱۲۹)

کیوں ہڈیوں پہ جنگِ سگانِ سرِ کو ہے — وارث ہیں یہ کیا عاشقِ مسکیں کے تمھارے

(۱۳۰)

مرگ تو اک خوابِ راحت ہے مگر حسرت یہ ہے
کیسے کیسے آشنا ہم سے جدا ہو جائیں گے

وصلِ دائم کی ہوس میں اتنی کرتے سعی کیوں
گر خبر ہوتی کہ یوں مل کر جدا ہو جائیں گے

(۱۳۱)

مرتا ہوں میں تو اور یہ اب پوچھتے ہو کیوں
یہ تو نے کس کے واسطے حالت تباہ کی

ہر ایک اپنا حال دکھانے میں محو تھا
کیا جانے اُس نے بزم میں کس پر نگاہ کی

جانا ہم اس گلی میں ابھی آپ چھوڑ دیں
ناصح جو کوئی بات کہیں آپ راہ کی

قاصد میں آپ سے تجھے واں بھیجتا نہیں
دی تھی قسم کسی نے رسالت پناہ کی

دو چھڑ کیوں یہ بیٹھے ہو تسکین منہ بنائے
اس حوصلے پہ آپ نے کاہے کو چاہ کی

(۱۳۲)

وہاں پہ یہ ٹھہری ہے کہ ملیے عاشقِ دلگیر سے
بوالہوس یوں ہی خوشی ہے آہِ بے تاثیر سے

دیکھتے ہی شوق نے ایسا کیا بے اختیار
حالِ دل کہنے لگے ہم یار کی تصویر سے

ہجر کی شب کو ہے طولانی یہ اتنا ناز کیوں
چھپ رہا ہے مہر دودِ نالۂ شبگیر سے

ہے ہوا کے دوش پر اتنا غبارِ مضطرب
اب بھی پھرتے ہیں ترے کوچے میں کس توقیر سے

وہ مسیحا لب اگر آئے تو جی اٹھوں ابھی
ہاتھ اُٹھایا چارہ سازوں نے عبث تدبیر سے

گر کوئی بھولے سے اسکی بزم میں دے مجھ کو جام
زہر ہو جائے نگاہِ قہر کی تاثیر سے

کوچۂ قاتل میں دشمن بھی بِن آئے مر گیا
موت کیا ڈرتی ہے اس کی برشِ شمشیر سے

تم تصور سے مرے کس طرح جاؤ گے نکل
حلقۂ آنکھوں کے سوا ہیں حلقۂ زنجیر سے

چین سے بیٹھے رہے محفل میں تسکیںؔ رات بھر
اس نے پہچانا نہ ہم کو رنگ کے تغیّر سے

(۱۳۳)

جاں ٹھہری نہ اس ابروئے خمدار کے آگے
سچ ہے نہیں تھمتا کوئی تلوار کے آگے

میں تیرے لیے ناصح مشفق سے لڑوں اور
تو کہوے بُرا یوں مجھے اغیار کے آگے

اس چشم پہ مرتا ہوں یہ وسواس ہے کیونکر
میں ذکر کروں مرنے کا اغیار کے آگے[1]

(۱۳۴)

قطعہ در ہجو غلام جیلانی آبدار

شمر ثانی غلام جیلانی
آبرو دے مگر نہ دے پانی

خونِ سادات کا یہ پیاسا ہے
ابن ملجم کا یہ نواسا ہے



ترقیمہ :۔ دیوان تسکینؔ نوشتہ و مرتبہ نمودہ مہدی علی خاں حسب الحکم نواب محمد کلب علی خاں صاحب۔

---

[1] یہ تینوں شعر مجمعِ کریم الدین سے لیے گئے ہیں۔

پیشگفتار

اپنے انتقال سے ڈھائی سال پہلے خود غالب نے اپنے کلام کا ایک انتخاب کر کے نواب رام پور کو نذر کیا تھا۔ اس انتخاب کی یہی اہمیت ہے جو اگلے صفحات میں آپ کی نظر سے گزرے گا۔

عرشی صاحب نے اس انتخاب کے بارے میں، جس کا اصل مسودہ رام پور میں محفوظ ہے، اور جس کا ایک ڈی لکس ایڈیشن عرصہ ہوا کتاب خانہ عالیہ نے شائع کیا تھا، لکھا ہے :۔

"مرزا صاحب نے اپنے ابتدائی اردو کلام کو ۲۵ سال کی عمر کے بعد خود منتخب کر کے ایک دو جزو کا چھوٹا سا دیوان مرتب کر لیا۔ اس کے بعد مرزا صاحب ہمہ تن فارسی کی طرف متوجہ ہو گئے اور ۵۰ تک اسی شیوے کو نباہتے رہے۔ قلعہ معلے کے تعلق نے ان کی توجہ پھر ریختے کی طرف منعطف کی۔ اور ذوق کے انتقال پر استاد شاہ کا اعزاز پانے کے بعد تقریباً اردو ہی میں کہنے لگے۔ اس زمانے میں دلی اور باہر کے بہت سے شاعروں نے اپنا اردو کلام اصلاح کے لئے بھیجنا شروع کیا جس کے باعث اس روش کی ساخت و پرداز میں زیادہ وقت گزرنے لگا۔ تا آنکہ ۱۸۵۷ء تک اتنا بڑا دیوان تیار ہو گیا جس کا حجم ابتدائی دیوان

کے انتخاب کے تقریباً برابر تھا۔ اس کے بعد مرزا صاحب کی شاعرانہ زندگی کی تخلیقی حرکت بڑی حد تک ختم ہوگئی۔"

جون ۱۸۶۲ء میں مطبع نظامی کان پور سے ۱۷۹۹ اشعار پر مشتمل غالب کا متداول اُردو دیوان شائع ہوا۔ اور جب ۲۵ اگست ۱۸۶۶ء کو نواب کلب علی خاں نے اپنی بیاض اشعار کی ترتیب کے لئے غالب سے اُن کے دیوان کے انتخاب کی فرمائش کی، تو ۱۰ ستمبر تک اسی نسخے کے اشعار پر صاد کر کے غالب نے انھیں نقل کرایا اور ۲۸ ستمبر کو یہ انتخاب نواب صاحب کی خدمت میں بھیج دیا۔

"نظامی ایڈیشن کے ابیات کی مجموعی تعداد ۱۷۹۹ ہے، جن میں ۱۵۰۲ شعر غزلوں کے، ۱۶۲ قصائد کے، ۱۱۵ قطعات کے، ۳۲ رباعیوں کے، اور باقی ۲۵ مثنوی انبہ کے ہیں۔ انتخاب میں مثنوی مکمل چن لی گئی ہے۔ بقیہ اصناف میں سے غزلوں کے ۳۶۷ قصیدوں کے ۹۲، قطعات کے ۴۰ اور رباعیوں کے ۱۰ شعر انتخاب کیے گئے ہیں، جن کی مجموعی تعداد ۵۴۸ ہوتی ہے۔"

انتخاب کا معاملہ یہ ہے کہ موڈ، موقع، مصالح، مذاق ــــ مختصراً: بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ انتخابی نظر میں بھی تبدیلی آتی رہی ہے۔ اب یہ کسے اندازہ ہوگا کہ غالب نے کبھی مندرجہ ذیل خوبصورت اشعار کو خود اپنے کلام سے نظرانداز کر دینے پر اپنے آپ کو راضی کر لیا تھا۔

دیر و حرم، آئینہ تکرار تمنّا — واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

تماشائے گلشن، تمنّائے چیدن — بہار آفرینا! گنہ گار ہیں ہم

اسدؔ طلسم قفس میں رہے، قیامت ہے — خرام تجھ سے، صبا تجھ سے، گلستاں تجھ سے

دلِ دیوانہ کہ وارستۂ ہر مذہب تھا
آخرش کار گرفتارِ زلف ہوا

سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا
ربط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار

نہ رکھ آپ سے تعلق، مگر ایک بدگمانی
بفریب آشنائی، بخیال بے وفائی

کجی یک خط مسطر، چہ توہم چہ یقیں
موج خمیازہ یک نشہ، چہ اسلام وچہ کفر

ہے دشت امکاں کو ایک نقشِ پا پایا
ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب

ع سادہ و پرکار تر، غافل و ہشیار تر
حسرتِ جولاں بسیار ع پائے رفتار کم

ع اے ہمہ خواب گراں، حوصلہ بدنام ہے

آئینۂ خیال کو دیکھا کرے کوئی
تمثال جلوہ، عرض کرے حسن کب تلک

وہ جلوہ کر کہ نہیں جانوں اور نہ تو جانے
خبر نگہ کو نگہ چشم کو عدو جانے

دامن کو آج اس کے حریفانہ کھینچیے
عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر

واماندۂ ذوق طرب وصل نہیں ہوں
اے حسرتِ بسیار تمنا کی کمی ہے

مندرجہ بالا اشعار نسخۂ حمیدیہ سے لئے گئے ہیں جن کے انتخاب کی ذمہ داری ان کے دوستوں پر ہے۔ بظاہر غالب جس سے بری ہیں لیکن مثلاً متداول دیوان کا پیش نظر انتخاب کرتے وقت ذیل کی غزلوں سے ایسے خوبصورت شعر چھوڑ دینا کیسا ظلم ہے:-

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی!
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

سادگی و پرکاری، بے خودی و ہشیاری
حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی
دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی
ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

بعض دوسری غزلوں میں بھی آپ کو ایسی مثالیں کہیں کہیں مل جائیں گی۔
اس لئے اس انتخاب میں آپ کو بعض بہت اچھے شعر نہ ملیں تو تعجب نہ کیجیے،
اچھے اشعار کا بہت بڑا حصّہ اس میں آگیا ہے، یہی غالب کا کریڈٹ ہے۔



جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے؟ ہم نے مدعا پایا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

دوست دار دشمن ہے اعتماد دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا

ہیں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد
کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

تھی نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفاں نکلا

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوشہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گُل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

تُو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
میں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اُچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا

گو نہ سمجھوں اُس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

بے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال / خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھُلا
منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں / زلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے منہ پر کھُلا
کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال / نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھُلا

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا / شعلۂ جوالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا
نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا / تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا
مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے / خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا
آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے / کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا
یاد کر وہ دن کہ ہر یک حلقہ تیرے دام کا / انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا
میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے / اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب / خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا
گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں / جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گذار تھا
کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب / دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا / آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی / در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ / ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب / جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بباد / یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا
دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا / زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائینگے کیا
بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک / ہم کہینگے حالِ دل اور آپ فرمائینگے کیا

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا
کہاں تک اے سراپا نازکی کیا

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا

سن اے غارت گرِ جنسِ وفا سن
شکستِ شیشۂ دل کی صدا کیا

درخورِ غیض و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

سینہ کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا — خاک کا رزق ہے، وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا
نام کا میرے ہے جو دُکھ کہ کسی کو نہ ملا — کام میں میرے ہے جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا
ہر بنِ مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوں ناب — حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا
قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل — کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

زکاتِ حُسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا — چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا
وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے — چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب — پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائے گا
دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا — یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا
سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا — مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا
وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو — اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما — کام گر رُک گیا روا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دلستانی ہے — لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے — ہمیں دماغ کہاں حُسن کے تقاضے کا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اُس کو یاد اسد جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا
اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا
ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا
درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا
تنگیٔ دل کا گلا کیا یہ وہ کافر دل ہے کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
ہوا جب غم سے یوں بےحس تو غم کیا سر کے کٹنے کا نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا
ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

بلبل کے کاروبار میں ہیں خندہ ہائے گل کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا
تھا گریزاں مژہ یار سے دل تا دمِ مرگ دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی کیوں ترا راہگذر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا — آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ — اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں — کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی — گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

پیشہ میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام — ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی — آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا — اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے — خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے — آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک — میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں — جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے — صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

قاصد کی اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے — اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا — جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں — شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن — غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

رشک کہتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن، اور آوارگی کا آشنا

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب
آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کے مکاں اپنا

درد دل لکھوں کب تک، جاؤں ان کو دکھلادوں
اُنگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

گھستے گھستے مٹ جاتا، آپ نے عبث بدلا
ننگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

سرمۂ مفتِ نظر ہوں مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پُرگل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد — تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ — اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال — ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے — سر سے گزرے پہ بھی ہے، بالِ ہما موجِ شراب

افسوس کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے — جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت — پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت
جگر کو مرے عشق خوننابہ مشرب — لکھے ہے خداوندِ نعمت سلامت
علی الرغم دشمن شہیدِ وفا ہوں — مبارک مبارک سلامت سلامت

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مری بالیں پہ اسے پر کس وقت

عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے — کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست
چشمِ ما روشن کہ اس بیدرد کا دل شاد ہے — دیدۂ پرخوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست
یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ — ہے ردیفِ شعر میں غالب ز بس تکرارِ دوست

اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل — سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج
لو ہم مریضِ عشق کے تیمار دار ہیں — اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد — بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے / شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی / ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگن عشق / ہے مکرر لبِ ساقی میں صلا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی / کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار / نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

وفورِ شوق نے کاشانہ کا کیا یہ رنگ / کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

نہیں ہے سایہ کہ سن کر نویدِ مقدمِ یار / گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے / کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پہ در و دیوار

وہ آ رہا مرے ہمسایے میں تو سائے سے / ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار

نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی / ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر / جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں / لیوے نہ نام کوئی ستمگر کہے بغیر

چھوڑوں گا میں نہ اس بتِ کافر کا پوجنا / چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام / چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو / بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات / سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر / جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا / رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

ثابت ہوا گردنِ مینا پہ خونِ خلق / لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ — لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر
زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال — رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر
گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویش مرہم سے
بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری، آتش برستی تھی گلستاں پر

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

ہے بس کہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گذرتا ہے گماں اور

یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھکو زباں اور

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

ہے خونِ جگر جوش میں، دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلّاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

مٹ جائے گا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا ۔ ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے ۔ کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز ۔ کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز
دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے ۔ ہے ترے تیر کا پیکان عزیز
تاب لائے ہی بنے گی غالب ۔ واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز ۔ میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرائشِ خمِ کاکل ۔ میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے
خوب وقت آئے تم اُس عاشقِ بیمار کے پاس

دیکھ کر تجھ کو چمن بس کہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گُل گوشۂ دستار کے پاس

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے
بیٹھنا اُس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزا ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ واہ
یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جا نمک

یاد ہیں غالبؔ تجھے وہ دن کہ وجدِ شوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن!
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

ایجاد کرتی ہے اُسے تیرے لیے بہار — میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گُل
تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک — بے اختیار دوڑے ہے گُل در قفائے گُل

▲

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسد
جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ ہم

مجھ کو دیار غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

وہ حلقہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا
رکھ لیجو مرے دعوے وارستگی کی شرم

لوں وام بخت خفتہ سے یک خواب خوش ولے
غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانی خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

دیکھیے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اس کی ہر بات پہ ہم نام خدا کہتے ہیں

آرزو کیا خاک اس گل کی کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگ پیراہن جو دامن میں نہیں

ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہ آفتاب
ذرے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

ہو فشار ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا
گر اک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تُو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے خدا نکردہ تجھے بیوفا کہوں

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اُٹھا بھی نہ سکوں

ہم سے کُھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے وگرنہ مُراد امتحاں نہیں

کس مُنہ سے شکر کیجیے اس لُطفِ خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستم عزیز، ستمگر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

بوسہ نہیں، نہ دیجیے دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

ہر چند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے
ہر چند پشتِ گرمیِ تاب و تواں نہیں

جاں مطربِ ترانۂ ھل مِن مزید ہے
لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں

ہے ننگِ سینہ دل اگر آتشکدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی
غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

سر کھجاتا ہے جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے
لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں

مت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں
ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

برشکالِ گریۂ عاشق ہے دیکھا چاہیئے
کھل گئی مانندِ گل سو جا سے دیوارِ چمن

ہے تجلی تری سامانِ وجود
ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہگذر کو میں

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اُس بتِ بیداد گر کو میں

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق
مژدۂ قتل مقدّر ہے جو مذکور نہیں

شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لینگے قیامت میں تمھیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں
عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب ہمکو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں
کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں
نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا دی ہے جائے دہن اس کو دمِ ایجاد "نہیں"
کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

ترے توسن کو صبا باندھتے ہیں ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں
قیدِ ہستی سے رہائی معلوم اشک کو بے سروپا باندھتے ہیں
اہلِ تدبیر کی واماندگیاں آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں
حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

۲۵

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ان پریزادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینہ میں اُبھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

٢٦

غم سے جب خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے غم
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں
یعنی ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں

ودیعت خانۂ بیدادِ کاوش ہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے مرے ہر قطرہ خوں تن میں

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

ہزاروں دل دیے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں

مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے
وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

۲۷

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

دَیر نہیں حرم نہیں، در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم کوئی ہمیں اُٹھائے کیوں

دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حُسن اور اُس پہ حُسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں

واں وہ غرورِ عز و ناز یاں یہ حجاب پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

غالبؔ خستہ کے بغیر، کون سے کام بند ہیں؟
روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں



غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں مُنہ سے مجھے بتا کہ یوں
رات کے وقت مے پیے، ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں
میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

بقدرِ حسرتِ دل چاہیے ذوقِ معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو؟
طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو
ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو
غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو
چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بارِ نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
یوں ہو تو چارۂ غمِ اُلفت ہی کیوں نہ ہو
ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجئے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو
ہٹتا ہے فوت فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا بُرا کیا ہے نواسنجانِ گلشن کو
نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو
خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو
ابھی ہم قتل گہہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو
ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا
کیا بے تاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آئے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو



دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانو

ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانو

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پانو

واں اسکو ہولِ دل ہے تو یاں ہوں میں شرمسار
یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

واں پہنچ کر جو غش آتا پے ہم ہے ہم کو
صدرہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ اُمید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

کیا وہ بھی بیگنہ کش و حق ناشناس ہیں
مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

اُبھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو

تم ہی کہو کہ گذارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا!
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھیرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو



مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے — بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے
سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری — تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی
نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی
مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

بیدادِ وفا دیکھ کے جاتی رہی آخر
ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
سُن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے
غالبؔ ترا احوال سُنا دیں گے ہم اُن کو
وہ سُن کے بُلا لیں یہ اجارا نہیں کرتے

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

کھُلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب
قسم کھائی ہے اُس کافر نے کاغذ کے جلانے کی
ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی
کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالبؔ
بدی کی اُس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے
ہے کائنات کو حرکت ترے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے
کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر!
غالب ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہرباں ہے

کس طرح کاٹے کوئی شبہائے تارِ برشکال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل تس پر یہ نا امیدواری ہائے ہائے

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
ابتک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

پی جسقدر ملے شبِ مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے!

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا
ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

مجھ سے مت کہہ "تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی"
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

خزاں کیا، فصلِ گل کہتے ہیں کس کو؟ کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم
اثر فریادِ دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

پیکرِ عشاقِ سازِ طالعِ ناساز ہے
نالہ گویا گردشِ سیّارہ کی آواز ہے

عشق مجھکو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے

بے صرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے”

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں
بھولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے

غالب تمھیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

گزرا اسد مسرتِ پیغامِ یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے
یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی "کہ وہ آئے"

ہوں کشمکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت
کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اُس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

کی ہمنفسوں نے اثرِ گریہ پہ تقریر
اچھے رہے آپ اُس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

اس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالب
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

پھر اُسی بیوفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی
نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذت زندگانی کی

یہاں تھا دام سخت قریبِ آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آ کے دم ہوئے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

غیر کو یارب وہ کیوں کر منع گستاخی کرے
گر حیا بھی اُس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دل کی یہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

دُور چشم بد تری بزم طرب سے واہ وا
نغمہ ہو جاتا ہے واں، گر نالہ میرا جائے ہے

اُس کی بزم آرائیاں سُن کر دلِ رنجور یاں
مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

ہو کے عاشق وہ پری رو اور نازک ہو گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر اُتنا ہی کھنچتا جائے ہے

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

سادگی پر اُس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے
دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اِک ادا میں رضا مند گئی
شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراغ
تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی
اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا، ہوسِ بال و پر گئی
نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی
فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

لازم نہیں کہ خضرؑ کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوز غم ہائے نہانی اور ہے

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

قاطع اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہے

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی

مجھے اُس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی
کبھی کودکی میں جس نے نہ سُنی مری کہانی

یوہی دُکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا
کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار گر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بجلوہ دشمنِ ایماں و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغباں و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی !
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے

گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو
ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

قتل کا میری کیا ہے عہد تو بارے
وائے اگر عہد استوار نہیں ہے

تو نے قسم میکشی کی کھائی ہے غالب
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے

ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے — جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے
سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر — تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے
اس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ — طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے
مر جاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک — آغوشِ خمِ حلقۂ زنار میں آوے
تب چاکِ گریباں کا مزہ ہے دلِ ناداں — جب اک نفس الجھا ہوا ہر تار میں آوے

حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے — اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے
بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ — جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا — ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے
ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق — وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن!
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی — امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی
مے پرستاں خمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے — ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

عجب نشاط سے جلّاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سایہ سے سر پانو سے ہے دو قدم آگے

قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ اُلفت
فقط 'خراب' لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے

خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اُس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

قسم جنازہ پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالبؔ
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

شکوہ کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلہ ہوتا ہے

پُر ہوں میں شکوہ سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بے داد کہ ہم
آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں، اور بُرا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

ہر اک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے
چپک رہا بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے
نہ شعلہ میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے
جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے
رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو وہ لہو کیا ہے
وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے
پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے
رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

میں اُنھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں — چل نکلتے جو مے پئے ہوتے
قہر ہو یا بلا ہو، جو کچھ ہو — کاش کہ تم مرے لئے ہوتے
میری قسمت میں غم گر اتنا تھا — دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب!
کوئی دن اور بھی جئے ہوتے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو — ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے
عشق نے غالب نکمّا کر دیا — ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر — روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا روئے آب پر کائی

تغافل دوست ہوں میرا دماغِ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجئے تو جا میری بھی خالی ہے
رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

خلشِ غمزۂ خونریز نہ پوچھ — دیکھ خونابہ فشانی میری
کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار — مگر آشفتہ بیانی میری

متقابل ہے مقابل میرا
رُک گیا دیکھ روانی میری

ذہن اُس کا جو نہ معلوم ہوا
کھُل گئی ہیچ مدانی میری

ازبسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے انداز
جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے

اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے

دوستی کا پردہ ہے بے گانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

دُشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے

ہر قدم دُوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں
صُورتِ دُود رہا سایہ گریزاں مجھ سے

شوقِ دیدار میں گر تُو مجھے گردن مارے
ہو نگہ مثلِ گلِ شمع پریشاں مجھ سے

بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہے ہے
سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر!
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آویں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

چاک کی خواہش اگر وحشت بعریانی کرے
صبح کی مانند زخمِ دل گریبانی کرے

خطِ عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد
یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو
جو دے نہ بوسہ تو مُنہ سے کہیں جواب تو دے

پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے، شراب تو دے

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالیں ہے، مرا تن بارِ بستر ہے

سرشکِ سر بصحرا دادہ، نور العینِ دامن ہے
دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے

خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے ہو
فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

بطوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

ابھی آتی ہے بُو بالش سے اُس کی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالبؔ
کہ بے تابی سے ہر یک تارِ بستر خارِ بستر ہے

سمجھ اس فصل میں کوتاہیٔ نشو و نما غالبؔ
اگر گُل سرو کی قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے / نالہ پابندِ نے نہیں ہے
ہر چند ہر ایک شے میں تُو ہے / پر تجھ سی کوئی شے نہیں ہے
ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی / ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے
کیوں ردِّ قدح کرے ہے زاہد / مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ
آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے / مرتے ہیں ولے اُن کی تمنا نہیں کرتے

کیوں نہ ہو چشمِ بتاں محوِ تغافل کیوں نہ ہو ۔۔۔ یعنی اس بیمار کو نظارہ سے پرہیز ہے

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائیگی ۔۔۔ وائے ناکامی کہ اُس کافر کا خنجر تیز ہے

دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیے ۔۔۔ ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہیے

یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے ۔۔۔ قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہمکو فریب ۔۔۔ کہ بن کہے بھی اِنھیں سب خبر ہے کیا کہیے

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال ۔۔۔ کہ یہ کہے کہ سرِ رہ گذر ہے کیا کہیے

اُنھیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے کیوں لڑیے ۔۔۔ ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے کیا کہیے

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے ۔۔۔ کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

کیوں نہ ہو بے التفاتی اُس کی خاطر جمع ہے ۔۔۔ جانتا ہے محوِ پرسشہائے پنہانی مجھے

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی ۔۔۔ لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے!

تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے ۔۔۔ سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب مجھے

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے ۔۔۔ جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر ۔۔۔ ہنوز اُس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے ۔۔۔ شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو ۔۔۔ ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے
تکلّف بر طرف نظّارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے
قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے
یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زلف گر بن جاؤں تو شانے میں الجھا دے مجھے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے آگے
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے
جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستی اشیاء مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا حال ہے تیرا مرے آگے
ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے
عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے
خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شب ہجراں کی تمنا مرے آگے

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

کہوں جو حال تو کہتے ہو "مدعا کہیے"
تمھیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ "ہم ستمگر ہیں"
مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو "بجا" کہیے

جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیے
جو ناسزا کہے اس کو نہ ناسزا کہیے

کہیں حقیقتِ جانکاہیِ مرض لکھیے
کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیے

کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے
کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

رہے نہ جاں تو تغافل کہ خوں بہا دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے
روانیِ روش و مستیِ ادا کہیے

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ مے کشی
تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلا
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے
دعویٰ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے

شورشِ باطن کے ہیں احباب منکر، ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی — مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
افسردگی نہیں طرب انشائے التفات — ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی
چاکِ جگر سے جب رہِ پُرسش نہ وا ہوئی — کیا فائدہ کہ جیب کو رُسوا کرے کوئی
ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز — تُو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عُمر — فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی
بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل — جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی
ابن مریم ہوا کرے کوئی — میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی — ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
چال جیسے کڑی کمان کا تیر — دل میں ایسے کہ جا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے — وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا — کچھ نہ سمجھے خُدا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی

تمھاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے
رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے
سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے — سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے
زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے — دیکھوں اب مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے

بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم ولے — کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہیگا اس کی گردن پر
وہ خوں جو چشم تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے

نکلنا خُلد سے آدم کا سُنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھُل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

اگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھکر قلم نکلے

ہوئی اس دَور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جام جم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

جز زخم تیغ ناز نہیں دل میں آرزو
جیب خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

لب عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
قیامت کشتۂ لعل بتاں کا خواب سنگیں ہے

آمد سیلاب طوفان صدائے آب ہے
نقش پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

ہوں میں بھی تماشائی نیرنگ تمنا کا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

سیاہی جیسے گر جاوے دم تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغر متاع دست گرداں ہے

غم آغوش بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغ روشن اپنا قلزم صرصر کا مرجاں ہے

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ
نظارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے

پیچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

غفلت کفیل عمر و اسد ضامن نشاط
اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

شعلے سے نہ ہوتی ہوس شعلہ نے جو کی
جی کس قدر افسردگی دل پہ جلا ہے

اے پرتو خورشید جہاں تاب ادھر بھی
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اک خوں چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں — کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی
ہے کیا ضرور سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے — یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ — ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے
زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے — آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے، پہ بدنام بہت ہے

مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے — جوشِ قدح بزم چراغاں کئے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو — عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس — زُلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو — سُرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے



قصائد

ہاں مہِ نو سنیں ہم اُس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح
یہی انداز اور یہی اندام

بارے دو دن رہا کہاں غائب
بندہ عاجز ہے گردشِ ایام

اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا
آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص
حبّذا اے نشاطِ عام عوام

عُذر میں تین دن نہ آنے کے
لے کے آیا ہے عید کا پیغام

ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا
ترا آغاز اور ترا انجام

جانتا ہوں کہ آج دُنیا میں
ایک ہی ہے اُمید گاہ انام

میں نے مانا کہ تُو ہے حلقہ بگوش
غالبؔ اُس کا مگر نہیں ہے غلام

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تُو
تب کہا ہے بطرزِ استفہام

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ
قُرب ہر روزہ بر سبیلِ دوام

تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا
جز بتقریبِ عیدِ ماہِ صیام

جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تُو
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

ماہ بن، ماہتاب بن، میں کون؟
مجھ کو کیا بانٹ دے گا تُو انعام

میرا اپنا جُدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام

ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص
گر تجھے ہے اُمیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِّ فروغ
کیا نہ دے گا مجھے مئے گُلفام

جب کہ چودہ منازلِ فلکی
کر چکے قطع تیری تیزی گام

تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر
کوئے و مشکوئے و صحن و منظر و بام

دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
اپنی صورت کا اک بلوریں جام

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا
توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

غ

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام
تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام

مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں
غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام

بوسہ کیسا یہی غنیمت ہے
کہ نہ سمجھیں وہ لذّتِ دشنام

چھیڑتا ہوں کہ اُن کو غصّہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالبؔ اپنا نام

کہہ چکا میں تو سب کچھ اَب تو کہہ
اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام

کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام

تُو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن
نامِ شاہنشہِ بلند مقام

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ
مظہرِ ذوالجلال والاکرام

شہسوارِ طریقۂ انصاف
نوبہارِ حدیقۂ اسلام

جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز
جس کا ہر قول معنیٔ الہام

بزم میں میزبانِ قیصر و جم
رزم میں اُوستادِ رستم و سام

اے ترا لطف زندگی افزا
اے ترا عہدِ فرخی فرجام

چشمِ بد دور، خسروانہ شکوہ
لوحش اللہ! عارفانہ کلام

جاں نثاروں میں ترے قیصرِ روم
جرعہ خواروں میں ترے مرشدِ جام

مرحبا موشگافیِ ناوک
آفریں آب داریِ صمصام

تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف
تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام

رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند
برق کو دے رہا ہے کیا الزام

تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا
تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام

فنِ صورت گری میں تیرا گرز
گر نہ رکھتا ہو دستگاہ تمام

اس کے مضروب کے سر و تن سے
کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام

جب ازل میں رقم پذیر ہوئے
صفحہ ہائے لیالی و ایام

اور ان اوراق میں بہ کلکِ قضا
مجملاً مندرج ہوئے احکام

تیری توقیعِ سلطنت کو بھی
دی بدستور صورتِ ارقام

کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم
اس رقم کو دیا طرازِ دوام

ہے ازل سے روائیِ آغاز
ہو ابد تک رسائیِ انجام

صبح دم دروازۂ خاور کھلا
مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا

خسروِ انجم کے آیا صرف میں
شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود
صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو
موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا

صبح آیا جانبِ مشرق نظر
اک نگارِ آتشیں رخ سر کھلا

تھی نظر بندی کیا جب ردِ سحر
بادۂ گل رنگ کا ساغر کھلا

لا کے ساقی نے صبوحی کے لیے
رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ
کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

تاجِ زریں مہرِ تاباں سے سوا
خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا

شاہِ روشن دل بہادر شہ کہ ہے
رازِ ہستی اُس پہ سر تا سر کھلا

وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں
مقصدِ نُہ چرخ و ہفت اختر کھلا

وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے
عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا

مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے
منصبِ مہر و مہ و محور کھلا

لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک
میری حدِ وسع سے باہر کھلا

تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید
کس نے کھولا کب کھلا کیونکر کھلا

باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار
مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا

ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نفس
لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا
کاشکے ہوتا قفس کا در کھلا

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے   غ
یار کا دروازہ پاویں گر کھلا

مفت کا کس کو برا ہے بدرقہ
رہروی میں پردۂ رہبر کھلا

سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک
آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا

نامہ کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ
رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

دیکھو غالب سے اگر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال
پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا

خامہ سے پائی طبیعت نے مدد
بادباں بھی اُٹھتے ہی لنگر کھلا

مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ — یاں عرض سے رتبۂ جوہر کھلا

مہر کانپا، چرخ چکر کھا گیا — بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا

بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب — اب علوِ پایۂ منبر کھلا

سکۂ شہ کا ہوا ہے روشناس — اب عیارِ آبروئے زر کھلا

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے — اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا

جانتا ہوں، ہے خطِ لوحِ ازل — تم پہ اے خاقانِ نام آور کھلا

تم کرو صاحبقرانی جب تلک
ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

○

مثنوی در صفتِ انبہ

ہاں دلِ دردمند زمزمہ ساز — کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز

خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا — شاخِ گل کا ہے گل فشاں ہونا

مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیے — نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے — خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے

آم کا کون مردِ میداں ہے — ثمر و شاخ گوئے و چوگاں ہے

تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں — آئے یہ گوئے اور یہ میداں

آم کے آگے پیش جاوے خاک — پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک

نہ چلا جب کسی طرح مقدور / بادۂ ناب بن گیا انگور

یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے / شرم سے پانی پانی ہونا ہے

مجھ سے پوچھو تمھیں خبر کیا ہے / آم کے آگے نیشکر کیا ہے

نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ و بار / جب خزاں آئے تب ہو اس کی بہار

اور دوڑائیے قیاس کہاں / جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں

جان میں ہوتی گر یہ شیرینی / کوہکن باوجود غمگینی

جان دینے میں اس کو یکتا جان / پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر / کہ دواخانۂ ازل میں مگر

آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام / شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام

یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے / باغبانوں نے باغِ جنت سے

انگبیں کے بحکمِ رب النّاس / بھر کے بھیجے ہیں سر بمہر گلاس

یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات / مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات

تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل / ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل

تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس / رنگ کا زرد پر کہاں بو باس

آم کو دیکھتا اگر اک بار / پھینک دیتا طلائے دست افشار

رونق کارگاہ برگ نوا / نازشِ دودمانِ آب و ہوا

رہ روِ راہِ خلد کا توشہ / طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ

صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم / ناز پروردہ بہار ہے آم

خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو / نوبرِ نخلِ باغِ سلطاں ہو

وہ کہ ہے والیٔ ولایت عہد — عدل سے اُس کے ہے حمایت عہد
فخرِ دیں عزِّ شان و جاہِ جلال — زینتِ طینت و جمالِ کمال
کارفرمائے دین و دولت و بخت — چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت
سایہ اُس کا ہما کا سایہ ہے — خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے
اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور — جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور
اُس خداوندِ بندہ پرور کو — وارثِ گنج و تخت و افسر کو
شاد و دلشاد و شادماں رکھیو — اور غالب پہ مہرباں رکھیو

○

قطعات

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر — اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل
پاؤں سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ — فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل
تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام — تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل
تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم — تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل
بسخن اوج دہِ مرتبۂ معنی و لفظ — بکرم داغ نہِ ناصیۂ قلزم و نیل
تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توقیر — تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل
ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر — زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل
تیری دانش مری اصلاحِ مفاسد کی رہین — تیری بخشش مرے انجاحِ مقاصد کی کفیل

تیرا اقبالِ ترحم مرے جینے کی نوید — تیرا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل
بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں — چرخِ کج باز نے تاکا کہ کرے مجھ کو ذلیل
پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ — پہلے ٹھونکی ہے بنِ ناخنِ تدبیر میں کیل
تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم — کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل
درِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی — غمِ گیتی سے مرا سینہ امر کی زنبیل
فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر — کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح — میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل
نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف — جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل
قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر — کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری — کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے
بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی جانے دو ملجاؤ — قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتے تھے

نہ پوچھی اُس کی حقیقت حضورِ والا نے — مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر — جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں — ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ — کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو — اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو — روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

گرچہ از روئے ننگِ بے ہنری — ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی — جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں — بادشہ کا غلامِ کار گزار
خانہ زاد اور مرید اور مداح — تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر — نسبتیں ہو گئیں مشخص چار
میری تنخواہ جو مقرر ہے — اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مُردہ کی چھماہی ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات — اور چھماہی ہو سال میں دو بار
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض — اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا — ہو گیا ہے شریک ساہوکار
ختم کرتا ہوں اب دُعا پہ کلام — شاعری سے نہیں مجھے سروکار
تم سلامت رہو ہزار برس — ہر برس کے دن ہوں پچاس ہزار

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے — جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے — کہ جو شریک ہو میرا شریکِ غالب ہے

رُباعیات

شب زُلف و رُخِ عرق فشاں کا غم تھا
کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک
ہر قطرۂ اشک دیدۂ پُرنم تھا

ہے خلقِ حسد قماش لڑنے کے لئے
وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لئے
یعنی ہر بار صورتِ کاغذ باد
ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لئے

بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جمجاہ نے دال
ہے لُطف و عنایت شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال، بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں
عشاق کی پرسش سے اُسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظُلم سے اُٹھایا ہو گا
کیوں کر مانوں کہ اُس میں تلوار نہیں

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے
کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ
وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

غالب اسٹڈیز کے یہ اغلاط درست کر لیجیے

(۱)

ص ۳ "سرمایہ" صحیح ہے "سرمایا" غلط ص ۳ جامعہ ... سطر ۲

ص ۱۲ "استقلال کے آزاد" "استقلال آزاد خ" غلط ص ۲۰ اشعار الغالب

ص ۲۳ "اس کتاب کے بارے میں ضمیر اریب کی" صحیح ہے ... بارے میں آئندہ غلط

(۳)

ص ۵/۴ تمثال جلوہ عرض کر اے حسن کب تک

ص ۶/۱ جذبہ ... ص ۷/۱ شرمندۂ سعی

ص ۸/۲ ہم نے قطرۂ خوں

ص ۹/۴ شعلۂ جوالہ ص ۹/۱۷ لخت دل بیاد

ص ۱۱/۱۹ تقاضے کا (تقاضا کا)

ص ۱۳/۱۰ اور روں پہ ہے وہ ظلم ص ۱۳/۱۲ دریا معاصی ...

ص ۱۹/۸ خامہ خونِ چکاں دینا ص ۲۶ چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کے بغیر

ص ۲۶/۳ منفعل نہ چاہ ص ۲۶/۶ ہم سے کھل جاؤ ...

ص ۲۶/۸ ... ناو شیاے مستوخال ... ص ۲۶/۹ نگین نام ...

ص ۲۶/۱۰ بیاں کس سے ہو ... ص ۳۳/۲ ... بانند زنجیرن

ص ۳۹/۸ رضا مند کر لی ص ۴۳/۱۲ آپ اٹھا لاتے ہیں ...

ص ۴۳/۷ معدولی میری ص ۴۳/۷

ص ۵۵/۵ سیاہ ہے جیسے ...

ص ۵۴/۸ جوشِ قدح سے بزم ... ص ۵۹/۵ رفتش

ص ۶۳/۱۶ سینہ علیم

دیوانِ تسکین کے اغلاط (غالب اسٹڈیز نمبر ۲)

(۲) چشمکیں غیر سے کر اپنی مجھے دکھلا دکھلا

(۴) آج آتے ہیں جو شکوے ...

(۱۱) مجھ پہ طوفان نہ کوئی تازہ اٹھا ہوئے گا

(۲۹) لایا جواب نامے کا قاصد...

(۳۰) شعر پر بریکٹ کاتب صاحب کا اضافہ ہے

(۵۶) اس کو میں مجھکو...

(۶۷) ہمو نامہ بر ہو سے ...

(۷۳) یاد میں اس گل کی رونا ...

(۸۱) بے دورِ بادہ گردشِ گردوں...

(۹۲) ہمارے زخم

(۱۰۱) مرتا ہوں ... ہنسی ہے

(۱۰۵) مانگ اب دیکھیے ...

(۱۲۵) خوشخط ہیں تیرے دیوان...

(۱۳۲) واں پہ ٹھہری ...

لارنس کے نام

گلوں پہ دل کا لہو بھی چھڑک دیا لیکن
خزاں کے ہاتھ میں ہے دامنِ بہار ابتک!

کیا کریں بھائی!

دیباچہ

گلوں پہ دل کا لہو بھی چھڑک دیا لیکن
خزاں کے ہاتھ میں ہے دامنِ بہار ابتک

زندگی کس کو میسر ہے زمانے میں ابھی
موت کے خوف سے کیوں لرزہ براندام ہیں سب

زندگی اس کو نہ کہیے یہ جیے جانا ہے
جس کا ہونا ہے کسی روز نہ ہونے کا سبب

زندگی جس کے لیے نشو و نما پاتی ہے
موت اس راہ پہ چلتی نہیں از راہِ ادب

موت کا زیست کی دنیا میں کہیں کام نہیں
یہ تو آغاز ہی آغاز ہے، انجام نہیں

آ تجھے فلسفۂ شوق بتا دوں یعنی
موت کی راہ نہیں دیکھتے مرنے والے

شوق راحت ہے تو پھر ہمتِ غم پیدا کر
دستِ گلچیں کے لیے آفتِ صد خار بھی ہے

تو نیاز و ناز تو ہو، ترتیبِ چمن کیا کم ہے
کچھ پھولوں کو تم بدلو گے، کچھ کانٹوں کو ہم بدلیں گے

کس سے کہیے کہ گلستاں میں جب آ لی ہے بہار
پھول تو پھول ہیں کانٹا بھی حسیں ہوتا ہے

گلوں کی شرم لطافت کا پاس ہے ورنہ
مری نگاہ تو کانٹوں کا انتخاب کرے

پھولوں سے جو چمن میں نگاہیں بچا گئے
کانٹوں کو وہ حیاتِ گلستاں بنا گئے

نگاہِ شوق میں اب زندگی معلوم ہوتی ہے
نہ ہوں کانٹے تو پھولوں میں کمی معلوم ہوتی ہے

بہارِ ذوق طلبگارِ گل نہیں سمجھی
کبھی ہوا بھی ہے کانٹوں سے راستہ مسدود

پھولوں میں جا کے ان کی نگاہیں الجھ گئیں
کانٹوں سے گلشنوں میں جو دامن بچا گئے

شاخِ گل، کون یہ سوچے گا کہ اک پھول سے قبل
کتنے کانٹے ترے پہلو سے نمایاں ہوں گے

اپنے احساس کو بیدار و جواں رکھ تو بھی
کائنات آج بھی بیدار و جواں ہے ساقی

لا کوئی خون کے دریا میں نہانے والا
خون تو سینۂ گیتی سے رواں ہے ساقی

موجوں کو جھیلنے کی اگر کچھ بھی تاب ہو
ساحل کی آرزو سے کنارا نہ چاہیے

یا ضبطِ صد صعوبتِ طوفاں کا ظرف ہو
یا امتحانِ وسعتِ دریا نہ چاہیے



نہیں کہ اپنی تباہی کا راز کو غم ہے
تمہاری زحمتِ عہدِ کرم کا ماتم ہے

نثار جلوہ دل و دیں۔ ذرا نقاب اُٹھا
وہ ایک لمحہ سہی، ایک لمحہ کیا کم ہے

کسی نے چاک کیا ہے گلوں کا پیراہن
شعاعِ مہر، تجھے اعتمادِ شبنم ہے؟

قضا کا خوف ہے، اچھا، مگر اس آفت میں
یہ معجزہ بھی کہ ہم جی رہے ہیں کیا کم ہے

وہ رقصِ شعلہ! وہ سوز و گدازِ پروانہ
جدھر چراغ ہیں روشن عجیب عالم ہے

حدودِ دیر و حرم سے گزر چکا شاید
کہ اب اجازتِ سجدہ ہے اور پیہم ہے

شمیمِ غنچہ و گل۔ رنگ لالہ۔ نغمۂ موج
ترے جمال کی جو شرح ہے وہ مبہم ہے

لطافتوں سے زمانہ بھرا پڑا ہے مگر
مری نظر کی ضرورت ہے کس قدر کم ہے

فریبِ دل نے محبت میں کھائے ہیں کیا کیا
ہر اک فریب پہ اب تک یقین محکم ہے

مری نگاہ کہاں تک جواب دے آخر
تری نگاہ کا ہر ہر سوال مبہم ہے

ابھی تو اپنی نگاہوں کے التفات کو روک
ابھی تو منظرِ ہستی تمام مبہم ہے



احساسِ بندگی سے بیگانہ کر دیا ہے
افراطِ بندگی نے دیوانہ کر دیا ہے

جو راز اتفاقاً منہ سے نکل گیا تھا
وہ راز احتیاطاً افسانہ کر دیا ہے

میں نے قدم قدم پر کعبہ بنا بنا کر
کعبے میں اہتمامِ بتخانہ کر دیا ہے

لازم ہے احتیاطِ ہر لفظ گفتگو میں
دُنیا نے راز کس کو رسوا نہ کر دیا ہے



وہ جور کیے جائیں یونہی بس یہ دعا ہے
اس جور کے انجام پہ امید وفا ہے

کیوں موت کو دلچسپ بنانے نہیں دیتی
دُنیا! مجھے بے عشق کیے بھی تو فنا ہے

انجامِ محبت کی گھڑی آ گئی شاید
معمول سے درد آج مرے دل میں سوا ہے

تجھ سے بھی کبھی تیری شکایت نہ کریگا
وہ راز جو منجملہ اربابِ وفا ہے



جو تم بہتر سمجھتے ہو روا رکھو محبت ہے
مجھے تو شرم سی آتی ہے اب شکر و شکایت سے

معافی مصلحت کے کچھ منافی ہے اگر یا رب
سزا کی شدتیں بڑھ جائیں احساسِ ندامت سے

شواہد رہنِ لفظ و گفتگو تو ہو نہیں سکتے
حقیقت اور چھپ جاتی ہے اظہارِ حقیقت سے



ناخدا کے رحم پر کشتی نہ چھوڑوں گا کبھی
میں اگر مجبور ہوں تو ڈوب مرنا چاہیے

طے کیے جاتا ہوں تکمیلِ جنوں کی منزلیں
ورنہ زنداں چاہیے مجھکو نہ صحرا چاہیے

رازؔ تخریبِ کلیسا سے نہ کر تعمیرِ دیر
ہر تماشا گاہ کا مجھکو تماشا چاہیے



پہلے بگڑا میں زمانے کو بنانے کے لیے
اب کے بگڑے گا زمانہ کہ سنورنا ہے مجھے

فکرِ امروز نہ اندیشۂ فردا ہے مجھے
اک ترے نام پہ مٹنے کی تمنا ہے مجھے



کب تک طوافِ دیر و کلیسا کرے کوئی
تو ہو کہیں تو تیری تمنا کرے کوئی

اس نازؔ آفریں کو نیازِ سخن کہاں
بیٹھا رہے وہ سامنے، دیکھا کرے کوئی



کہیں ایسا نہ ہو منہ پھیر کے جانے والے
کہ تغافل سے کھٹک جائیں زمانے والے

وجہِ وحشت بھی تو سوچیں گے زمانے والے
احتیاطاً مجھے دیوانہ بنانے والے

دامنِ صبر بھی ہاتھوں سے اگر چھوٹ گیا
او مرے ہاتھ سے دامن کو چھڑانے والے

میں تری رحمتِ بیداد کے لائق تو نہ تھا
تیرے قربان، مرے دل کو جلانے والے

لب پہ اک نام نہ لانے کا اگر ہوش رہے
تو کسے عذر ہے، دیوانہ بنانے والے

اعتراف اور محبت کا کسے کہتے ہیں
او! فقط مجھ سے نگاہوں کو بچانے والے

دل کی ہستی ہے محبت میں عجب بے آزار راز
جسکو سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے زمانے والے



اس در کی سی راحت بھی دو عالم میں کہیں ہے
جینا بھی یہیں ہے، مجھے مرنا بھی یہیں ہے

اب واقفِ مفہومِ وفا قلبِ حزیں ہے
اب آپ کی بیداد بھی بیداد نہیں ہے

تم اور مری خانہ خرابی پہ تبسّم
اُمّید سے بڑھ کر، ابھی قدرِ دل و دیں ہے

یا تیرے سوا، حُسن ہی دنیا میں نہیں تھا
یا دیکھ رہا ہوں کہ جو منظر ہے حسیں ہے

یہ زیست ہے یا موت، سمجھ میں نہیں آتا
اب درد ہے اور درد کی تکلیف نہیں ہے



تم اپنی نگاہوں کے تبسم کو نہ روکو
افراطِ تکلف کہیں رُسوا نہ بنا دے

ساقی جو تری مست نظر دیکھ چکا ہو
جس پھول کو دیکھے اسے پیمانہ بنا دے

اپنا نہ بنائے تو مجھے اپنے سوا تو
دنیا کے ہر احساس سے بیگانہ بنا دے

مختار رہے تو جب تری خواہش ہے تو اچھا
ہر شے کو مرے جبر کا افسانہ بنا دے



آئے تھے ہم تپشِ دل سے پریشاں ہو کر
جا رہے ہیں تری محفل سے پشیماں ہو کر

اب کہیں درد نہیں ہے، ترے قدموں کی قسم
اب نہ رو میرے تڑپنے سے پشیماں ہو کر

چشمِ مشتاق تری بات نہ مانوں گا کبھی
کوئی اُٹھ جائے گا محفل سے پشیماں ہو کر

اب کبھی کوئی شکایت نہ کرونگا تجھ سے
شکریہ دیکھنے والے مجھے حیراں ہو کر



تابِ نظر سے آج بہت بدگماں ہے دل
عہدِ وفا پر آپ کو تیار دیکھ کر

مفہوم ہر کرم کو بدلنا پڑا اُنھیں
بیکس کو ہر کرم کا سزاوار دیکھ کر

کون و مکاں بنا کے الگ ہو گیا کوئی
مشکوک ہوں میں فرقِ گل و خار دیکھ کر

دنیا نے اہلِ عشق کو دیوانہ کہہ دیا
پابندیٔ نیاز کو دشوار دیکھ کر

پروردگار خیر کہ صیاد سا بھی آج
چپ ہو گیا ہے سُوئے گرفتار دیکھ کر

دنیا کی ہر نگاہ سمجھنا پڑی مجھے
خود اپنے ہر خیال کو بیکار دیکھ کر



تیرے ہاتھوں میں ہے شراب کا جام
اب کسے فرصتِ حلال و حرام

اپنی ہستی کو کھو کے آیا ہوں
میں بھلانے چلا تھا اُن کا نام

مجھے حضور کے وعدوں پہ انتظار تو ہو
مگر یہ جب کہ کوئی وجہِ اعتبار تو ہو

علاجِ زخم و مداوائے دردِ دل نہ سہی
کوئی انیس تو ہو، کوئی غمگسار تو ہو

شریکِ راحتِ گلشن تمام عالم تھا
کوئی خزاں کے مصائب میں غمگسار تو ہو



اپنی رسوائی پہ نازاں ہوں کہ چھپنے والے
دیکھ لیتے ہیں بعنوانِ تماشا مجھ کو

میں تو مدہوشِ نظارہ تھا مجھے کیا معلوم
خبر ہے کس نے تمھیں دیکھتے دیکھا مجھ کو

ہاں ترے حُسنِ خود آرا کو تکلیف نہ رہے
دل پر آ جائے قیامت یہ گوارا مجھ کو



کھڑے کے تلوؤں سے کانٹے نکالنے والے
یہ ہوش ہے تو جنوں کامیاب کیا ہوگا

اگر گناہ کے قصے بھی کہہ دیے تجھ سے
گناہگار کو یا رب ثواب کیا ہوگا



دمِ تفریحِ گلشن پھول چن لینا تو آساں ہے
بہت مشکل ہے لیکن امتیازِ رنگ و بو کرنا

نہ بدلو، وضع بھی، کسبِ حقائق جبکہ مشکل ہے
وہ دیوانہ نہیں ہوتا جسے آتا ہو، ہو کرنا



غلط کہ فکرِ علاجِ جگر نہیں ہے مجھے
دماغ مصلحت چارہ گر نہیں ہی مجھے
جہاں میں جی کے وہ نقصاں اٹھائے ہیں میں نے
کہ اب قضا سے بھی خوفِ ضرر نہیں ہے مجھے
ملالِ زحمتِ بیداد گر ہی سُن لیجے
بجا شکایتِ بیداد گر نہیں ہے مجھے



لوگ مٹ کر تجھے مائل بہ کرم پاتے ہیں
یہ اگر سچ ہے تو دنیا کی ہر افتاد مجھے
جو ر اٹھا کر بھی محبت کی ندامت نہ گئی
تم نے ناشاد بنا کر بھی کیا شاد مجھے



تم اور تمنائے تلقینِ شکیبائی
اب حد کو پہنچتی ہے شاید مری رسوائی
کیوں راز پہ جینے کا الزام لگاتے ہو
خود مر تو نہیں سکتا مرنے کا تمنائی



بنا بنا کے نگاہوں سے بے قرار مجھے
مذاقِ یار نے جانچا ہے بار بار مجھے
دل اس کو کہتے ہیں شاید کہ عشق میں جس پر
نہ اختیار انھیں ہو نہ اختیار مجھے
کسی نے برق کی بیداد ہی کبھی نہ سنی
اور اس خطا میں کہ ہے شکوۂ بہار مجھے
تمہاری بات غلط ہو گئی تو غم کیا ہے
کہ پھر کہو تو پھر آجائے اعتبار مجھے
قفس میں کہتے ہیں طوفانِ ابر و برق جسے
چمن میں اس کو بتایا گیا بہار مجھے

ضبط کی مشکلیں ارے توبہ
ہر زباں پر سُنا ہے تیرا نام
بندگی ہے رہینِ عرضِ کرم
ایسی بندہ نوازیوں کو سلام
اُن گناہوں کی لذّتیں توبہ
جن سے جنّت ہوئی ہے مجھ پہ حرام
کل کی رات! آہ رازؔ کل کی رات
آج پھر سر پہ آرہی ہے شام

★

گل کی باتیں بہار کی باتیں
نہ رہیں اختیار کی باتیں
پھر کسی بات میں مزہ نہ رہا
اُف تری ایک بار کی باتیں
وہ اگر مائلِ کرم بھی ہوے
دل بھی سمجھے کا پیار کی باتیں؟
اک زمانے سے اب قفس والے
نہیں کرتے بہار کی باتیں
تیری ہر بات پر بجا و درست
ہائے بے اختیار کی باتیں
یا تو وحشت ہیں یا معمّہ ہیں
رازؔ اور رازدار کی باتیں

★

قفس کا ڈر نہ کچھ کھٹکا خزاں سے
چمن لے کر چلا ہوں آشیاں سے
الٰہی کون نکلا ہے مکاں سے
ستارے ٹوٹتے ہیں آسماں سے
محبت میں بڑی مجبوریاں ہیں
کہ خود اٹھا ہوں اُنکے آستاں سے
محبت کا مزہ مٹتا ہے یا رب!
ہوئے جاتے ہیں وہ کچھ مہرباں سے

★

بس اس خیال سے ڈرتے ہیں ہم گلا کرتے
کہ وہ جفا بھی نہ کرتے تو اُن کا کیا کرتے
ملی نہ ہم کو محبت میں یہ بھی آزادی
کہ دل میں ہوک جب اُٹھتی تو رو لیا کرتے



شوق نے آج قیامت کی بنا ڈالی تھی
خیر گزری کہ مری بات نہ سمجھا کوئی
ہر قدم پر نئی اُفتاد مبارک ہو مجھے
دیکھتا ہے مری دنیا کا تماشا کوئی
میری پُر شوق نگاہیں تو گنہگار سہی
نیچی نظروں سے کسے دیکھ رہا تھا کوئی



وفا کی موت بڑے خوش نصیب مرتے ہیں
یہ دل تو ورنہ زمانے میں ہے سبھی کے لیے



کتنے دل چیپ تھے تکمیل محبت کے قریب
اس نے یوں حوصلۂ قلب و جگر دیکھ لیا
گو بہت صاف تھے، آشفتہ نگاہی کے جواب
پھر بھی بیمار نے اکثر سوئے در دیکھ لیا



بدلی ہوئی ہے زمزمہ پردازیوں کی لے
اہلِ چمن یہ کس کی اسیری کا غم ہے آج
تھا رعبِ حسن مانع تردیدِ حسنِ ظن
کہنا پڑا کہ درد مرے دل میں کم ہے آج



فضا کے مضطرب نغمے نہ ہوں گے ہم زباں کب تک
سُناؤں گا ستاروں کو میں اپنی داستاں کبتک
جنونِ غم سے آدابِ تجلّی چاہنے والے
اگر میں نے بھی یہ سوچا کہ ذمہ داریاں کبتک
جنون و عقل کی حد سے گزر کر دیکھنا یہ ہے
کیے جاتے ہو تم پابندیِ رسمِ جہاں کبتک



تم اپنا درد کیا دیتے اگر یہ بھی سمجھ لیتے
جو مر سکتے ہیں وہ جینے کی زحمت کیوں اٹھاتے ہیں
اِن آنکھوں میں وہ عالم ہے نشیمن کی تباہی کا
کبھی بجلی چمکتی ہے تو پہروں تھرتھراتے ہیں
اُدھر سے بھی نگاہیں آج کچھ محروم سی پلٹیں
جدھر غنچے چٹکتے ہیں ستارے مسکراتے ہیں



دیکھنے والے تری نیچی نگاہوں کے نثار
کون سا کیف اب نہیں اس ہستیِ برباد میں
ہر بلائے باغ پر سو آشیانے ہوں نثار
اُف یہ کیسا خواب دیکھا خانۂ صیاد میں



وہیں گلیوں کا رونا چھوڑ کے میں بیٹھ جاؤں گا
مرے رونے پہ ہنسنے کی صدا آئے گی جس گھر سے

کبھی مشکوک تھا آ بیٹھنا میرا ترے در پر
مگر مذموم ہے اب تو مرا اٹھنا ترے در سے

طبیعت آشنائے شادی و غم ہوتی جاتی ہے
ذرا پھر چھیڑ دو دل کو نگاہِ ناز پرور سے

حِصرِ دیرِ قیدِ آدابِ تماشا، کیا یہ منشا ہے
تجھے دیوانہ بن کر دیکھ لیں دیدار کے ترسے



پریشاں کس لیے ہے خوف تجکو ناخدا کیا ہے
ضررِ طوفاں سے کشتی ڈوب جانیکے سوا کیا ہے

جلائے دیتی ہے سب بوستاں کو جس کی کاوش سے
چمن میں برق اُس کا چار تنکوں کے سوا کیا ہے



تجھ سے اک لفظ تو صیّاد کہوں گا لیکن
جب مری بات سمجھنا تجھے آساں ہو جائے

دل میں آباد تھا اک شہرِ تمنا لیکن
ہائے وہ شہر جو ہم رنگ بیاباں ہو جائے

ہزار پردوں میں چھپتا رہا جمالِ حبیب / نہ ہے نظر کا مقدر نہ ہے نظر کا نصیب
سمجھ رہا ہوں کہ سجدوں کی کیا ضرورت ہے / مگر جبیں کو میسر تو ہو دیارِ حبیب
جنوں پہ آج تک الزام کوئی رکھ نہ سکا / ہزار بار ہوئی اہلِ ہوش کی تکذیب



سجدوں سے تھا بلند بہت نقشِ پائے دوست / مجھ سے بڑا قصور ہوا اضطراب میں
ہر شے پہ اختیار ملا ہے مجھے مگر / جیسے کسی کا ہاتھ نہ روکیں عتاب میں



سزا کو جھیلنے والے یہ سوچتا ہے گناہ / کوئی قصور بھی تجھ سے کبھی ہوا کہ نہیں
ہر ایک شے کا تماشا گناہ تھا لیکن / سوال یہ ہے کہ میں تجھ کو ڈھونڈتا کہ نہیں
قدم قدم پہ ٹھہر کر یہ غور کرتا ہوں / یہاں کسی نے مجھے آسرا دیا کہ نہیں
وفا تو خیر بڑی کشمکش ابھی یہ ہے / کہ وہ جفا کی بھی زحمت اٹھائے گا کہ نہیں



کہاں یہ دامنِ دولت کہاں یہ دستِ سوال / ترے نثار بڑا آسرا دیا ہے مجھے
تمھیں خبر ہے تمہارے حجابِ پیہم نے / قدم قدم پہ تمہارا پتہ دیا ہے مجھے



پھولوں سے جو چمن میں نگاہیں بچا گئے / کانٹوں کو وہ حیاتِ گلستاں بنا گئے
کل امتحانِ شوق کی زحمت تھی ناگوار / آج اعتراض ہے کہ قدم ڈگمگا گئے
توفیقِ بندگی کا تعین حرام تھا / سجدوں سے اور کفر کے الزام آ گئے

اک دن یہیں کہیں وہ مناظرِ چمن کے بعد ساری فضا پہ رازؔ اندھیرے سے چھا گئے



ادا شناس رسوم چمن ملے تو کہوں وہ صبر جھیل چکا ہوں جو آشیاں کے لئے
اٹھا کے ذرّے ستارے سے کچھ بکھیر دیئے زمیں سے کچھ بھی نہ چھوٹا جب آسماں کے لئے
کہاں کہاں پہ قدم ڈگمگائے ہیں ورنہ نہ میں قفس کے لیے تھا نہ آشیاں کے لئے
چمن میں رازؔ نشیمن بنائے ہیں لیکن کبھی یہ چمن بھی بنائے آشیاں کے لئے



نشیمن کی تباہی ختم ہو کر خود بتا دے گی بہاریں جذب کر سکتی ہیں تاثیر خزاں کب تک



اے دستِ طلب آگے کو نہ بڑھ کیوں دل کے خزانے کھوتا ہے
توفیقِ گدائی سے پہلے احساسِ گدائی ہوتا ہے
اے عصمتِ غم کچھ تو ہی بتا جینے کا سلیقہ کیا ہوگا
رونے میں تردد ہوتا ہے ہنسنے میں تکلف ہوتا ہے



ہے تلخ تر یہ حقیقت کہ اہلِ دُنیا نے حقیقتوں کو چھپایا ہے کہہ کے افسانے
قدم قدم پہ مناظر بدلتے جاتے ہیں کسے کسے تگ و دو میں نگاہ پہچانے
کہاں کہاں کوئی سجدوں کے امتحاں سے بچے قدم قدم پہ بنائے گئے ہیں بتخانے
تھپک تھپک کے زمانے نے یوں جھنجوڑا ہے
کچھ اہلِ ہوش تو خود بن گئے ہیں دیوانے

مائل بہ کرم جس پہ بھی صیاد ہوا ہے
اے مرغِ قفس اور وہ برباد ہوا ہے

صیاد کی مرضی پہ نہ چھوڑ اپنی رہائی
آفاق میں یوں بھی کوئی آزاد ہوا ہے

گلشن ہی پہ موقوف نہ کر ذوقِ نظر کو
صحرا بھی ترے واسطے ایجاد ہوا ہے



بھری جب ایک غزالِ گریز پا نے زقند
لگائی ضیغمِ آہو شکار نے اک جست

یہ دل نشیں و بہار آفریں و چشم افروز
مگر دلیلِ ضعیفی و انتشار و شکست

وہ خوفناک و مہیب و کرخت و پیکِ قضا
مگر نمائشِ جوشِ نمود و قوتِ دست

قدم قدم پہ ہے اندیشۂ حیات اِدھر
اُدھر حیات ہے خود جوش دار و گیر میں مست



سیر و تفریح سراسر ہے کبوتر کی حیات
جنگ و پیکار ہے شاہیں کا مذاقِ پرواز

پر زنی خائفِ پیغامِ اجل ہے اس سمت
اور اُدھر زیست کا مژدہ ہے فرِ تگ و تاز

عافیت کوش اِدھر بال زنی کی طاقت
مرگ آغوش اُدھر جہدِ طرب کے انداز

آگیا امن سے واپس تو کرامت اس کی
اُس طرف صید نہ ملنا ہے اجل کا آغاز

نہ اِدھر جوشِ تمنا کی نیاز آشوبی
نہ اُدھر فرقتِ محبوب کی شبہائے دراز

نہ اِدھر قلب میں ہے جذبۂ خودداریِ شوق
نہ اُدھر عقل کو اندیشۂ تذلیلِ نیاز

نہ اِدھر رعد نما بانگِ مبارز طلبی
نہ اُدھر خوفِ قفس ہے نہ فسونِ آواز

نہ اِدھر قید مقامی سے مفر کی صورت
نہ اُدھر فکرِ اودھ ہے نہ خیالِ شیراز

(۱)

یہ میخانہ ہے اس میں لغزشیں تخلیق ہوتی ہیں
یہاں پی کر بہک جانا بہت آسان ہے ساقی
جسے ہر حال میں احساس ہو تیرے مراتب کا
شرابی ہے، شرابی کی یہی پہچان ہے ساقی
شرابی کی طرف رُخ کر تو دنیا تجھ کو پہچانے
کہ نادانوں کو مے دینا کوئی احسان ہے ساقی

(۲)

اگر دشوار ہے ذوقِ طلب کا امتحاں لینا
تو بارِ مے اٹھا لینا بھی کچھ آسان ہے ساقی
یہ ساغر التفاتِ خاص کا مظہر سہی لیکن
ترے ساغر کو پی جانا مرا احسان ہے ساقی
یہی دو گھونٹ، دو گھونٹوں کی وسعت میں سمجھتا ہوں
کسی قطرے میں پوشیدہ یہاں طوفان ہے ساقی



مری حیات ہے کلیوں میں رنگ آمیزی
مگر نظر سے بھی پھولوں کو چومنا ہے گناہ
مری حیات ہے موجوں سے کھیلنا لیکن
نشاطِ نغمۂ طوفاں سے کھیلنا ہے گناہ
سزائے دیدہ وری ہے سکون و خاموشی

یہاں دلوں کی حقائق رسی گناہ سہی
میں اب جسارتِ ذوقِ گناہ کرتا ہوں!
بچا سکے تو بچا اے فریب کی دُنیا
ترے نظامِ کہن کو تباہ کرتا ہوں
ہے دل کا تنگ، تمنّائے عافیت کوشی



پار جو سینۂ حق کوش کے ہو جاتا ہے — موت اُس تیر سے نخچیر ہوا کرتی ہے
اس حقیقت کو حسینؓ ابنِ علیؓ سے پوچھو — زندگی موت سے تعمیر ہوا کرتی ہے

عصمتِ غازہ و فسونِ لباس — یہ نہیں ہے نشاط کا مفہوم
آنکھ ہنسنے لگے تو کیا حاصل — دل نہ روئے تو عید ہو معلوم



تجدیدِ انتظامِ گلستاں کریں گے ہم — کانٹوں کے حسن کو بھی نمایاں کرینگے ہم
موجوں کو ہم نے زینتِ ساماں بنا لیا — سمجھے تھے وہ کہ شکوۂ طوفاں کرینگے ہم



قدم قدم پہ ہیں سرمایہ دار کے بندے — کوئی غریب کا پروردگار ہے کہ نہیں
جبینِ دہر پہ چینِ عتاب آتی ہے — کہیں تبسمِ برق و شرار ہے کہ نہیں



تری آمد نویدِ بالش و بستر سہی لیکن — بتا اے رات اب دنیا میں یہ کیا ہوتا جاتا ہے

الٹ کر رکھ دیا جیسے نظام نور بھی تو نے
ستارے کھلتے جاتے ہیں اندھیرا ہوتا جاتا ہے



نہ صرف یہ کہ زمانے کو زندگی نہ ملے
ہوا ان کا بس تو زمانے کو موت بھی نہ ملے

جو ماہتاب پہ سرمایہ دار جا پہنچیں
کسی غریب کی راتوں کو چاندنی نہ ملے



زوال مہر ہوا عہد انتقام آیا!
سحر سے قتل بہت ہو لیے غریبوں کے

جگر کے خون سے روشن کیا گیا ہے انھیں
اب آندھیوں میں جلیں گے دیے غریبوں کے

چند مزید شعر جو اپنا "انتخاب" دیکھ کر راز صاحب نے خود اس میں بڑھا دیئے تھے۔

کس کو جینے سے ہے فرصت جو یہ سوچے کہ ابھی
کوئی کام اور بھی جینے کے سوا ہے کہ نہیں

ہے ابھی فیصلہ باقی کہ دلوں پر اب تک
آپ سے کوئی ستم ہو بھی سکا ہے کہ نہیں

غریب دل بہمہ احتیاط عصمت درد
ٹھہر سکا نہ زمانے کی بندشوں کے قریب

نیند ناحق حرام ہوتی ہے
جاگنا ہے تو دیکھیے کیوں خواب

قدم قدم پہ ہو موجوں سے جس کو ٹکرانا
وہ جبر مصلحت ناخدا کو کیا جانے

تری جناب میں تشریح انتظار کے بعد
ہے اپنے ہوش میں آنے کا انتظار اب تک

کدھر جا رہے ہیں سفینے ہمارے
نہ امن اس کنارے نہ امن اس کنارے

خواب میں بھی بے نقاب آ کر وہ شرما جائے ہے
ہائے جیسے خواب بھی آنکھوں سے دیکھا جائے ہے

دیدنی ہوتی ہے پاس وضع کی وہ کشمکش
جب کبھی طرز تغافل سے وہ اکتا جائے ہے

بابائے اردو

اقبال مرحوم کی شاعری پر یوپی والے ناک بھوں چڑھایا کرتے تھے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں کے بعض نئے شاعر اب ان کی تقلید میں سرگرم ہیں۔ اس کا ایک تازہ نمونہ حضرت رازؔ یزدانی ہیں۔

حضرت رازؔ سے باہر کے لوگ زیادہ واقف نہ ہوں گے۔ ان کی عمر بھی غالباً ابھی کہولت کی منزل تک نہیں پہنچی لیکن ایک عزیز نے ہمیں لکھا ہے کہ رام پور میں ان کا کلام خاصی طرح مشہور و مقبول ہو گیا ہے، اور زیر نظر مجموعہ ("حرب و ضرب") سے بھی ظاہر ہے کہ وہ بڑے پرجوش اور پختہ مشق سخن گو ہیں۔

کچھ شبہ نہیں کہ رازؔ صاحب شعر گوئی کی فطری صلاحیت اور عمدہ مذاق رکھتے ہیں۔ لیکن بلند پردازی اور فلسفیانہ شاعری کو مقبول و پراثر بنانے کے لئے جب کہ وہ حقائق سے بحث کرتی ہو، بہت وسیع اور باقاعدہ مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ رازؔ صاحب نے فکر سخن کے ساتھ ساتھ اس طرف توجہ فرمائی تو ایک وقت میں خود صاحب طرز یا کم سے کم اقبال کے بہت اچھے معنوی جانشین ہو جائیں گے۔ (۱۹۴۴ء)

رشید احمد صدیقی

رازؔ صاحب مزے کے شاعر ہیں اور کہنے کے انداز میں بڑی شرافت ہے۔ کچھ شعر تو مجھے بہت پسند آئے ہیں مثلاً:

وہ سامنے سرِ منزل چراغ جلتے ہیں   جواب پاؤں نہ دیتے تو میں کہاں ہوتا

کھرکتے تلوؤں سے کانٹے نکالنے والے
یہ ہوش ہے تو جنوں کامیاب کیا ہوگا
اگر گناہ کے قصے بھی کہیے تجھ سے
گناہگار کو یارب ثواب کیا ہوگا

(۱۹۵۴ء)

نیاز فتحپوری

صدیقی ۔ گرامی نامہ ملا ۔ آپ نے اپنی شاعری کے رجحان کے متعلق جو کچھ فرمایا وہ میرے سامنے ہے ۔ اور میں ان خصوصیات سے بیگانہ نہیں ہوں ۔ آپ کی شاعری یقیناً میل راہ ہے ۔ افسوس ہے کہ اس وقت تک مجھے اتنی فرصت نہیں ملی جتنی آپ کے کلام پر اظہار خیال کے لیے ضروری ہے ۔

۱۹۴۲ء کے بعد سے اس وقت تک آپ نے جو غزلیں کہی ہیں، ان میں سے دس بارہ بھیج دیجے، ان کا انتخاب مارچ کے نگار میں شایع کرنا چاہتا ہوں اور اس سلسلے میں مجھے تفصیلاً نہ سہی اجمالاً ہی ایک موقع اظہار رائے کا مل جائے گا (۱۲ر جنوری ۵۴ء)

......غزلیں ملیں ۔ یقیناً آپ نظم کے شاعر ہیں آپ اپنی تازہ نظموں کی نقلیں بھیج دیجے ، میں نگار میں انھیں ایک خاص اسلوب سے پیش کروں گا ..... (۷ جنوری ۵۴ء)

...... آپ کا کلام مجھے بہت پسند ہے، اور بعض اشعار تو آپ نے ایسے لکھدیے ہیں کہ زمانہ انھیں بھلا نہیں سکتا .... (۱۳ نومبر ۵۴ء)

حامد حسن قادری

جناب محترم راز یزدانی صاحب ۔ السلام علیکم ۔

۲۴ر مارچ کے "خیام" میں آپ کا مضمون اس تحریر کا باعث ہوا ہے ۔ میں آپ سے

بلکہ صحیح یہ کہ آپ کے کلام سے تقریباً ۱۷، ۱۸ برس سے آشنا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ شاید آپ کے کلام سے دلچسپی سب سے پہلے آپ کا "مرثیۂ محمد علی" دیکھ کر پیدا ہوئی تھی۔ اس کو بھی پورے سترہ سال ہو گئے۔ آپ کا کلام جہاں نظر آیا ہے پڑھا ہے اور پسند کیا ہے۔ میرے علم میں رام پور میں دو چار سے زیادہ اچھے شاعر نہیں ہیں۔ ان میں ایک آپ بھی ہیں، دوسرے شاد عارفی ہیں، تیسرے ایک اور صاحب ہیں، نام دل ہی دل میں پھر رہا ہے، یاد نہیں آتا۔

کل شام خیام آیا، پہلے صفحہ پر آپ کی غزل تھی۔ مجھے عادت ہو گئی ہے کہ غزل دیکھتے ہی میں ساتھ ہی ساتھ دل میں تنقید کرتا جاتا ہوں۔ اسی طرح آپ کی غزل دیکھی۔ دوسرے صفحہ پر آپ کا مقالہ تھا، اس کو چھوڑ دیا۔ اس لیے کہ میں شعر گوئی کی کیونکر سے بدگماں سا ہوں اور سبب وہی ہے جو آپ نے لکھا ہے کہ شاعرانہ داستان سرائی اور سخنورانہ تصنّع سے کم نہیں ہوتا۔

رات میں پھر خیام اٹھایا اور آپ کا مقالہ کہیں بیچ میں سے پڑھنا شروع کیا۔ آپ نے عجب کیفیت لکھی تھی۔ آخر تک پڑھ گیا۔ شروع کا حصہ اس کے بعد پڑھا مقالے کے بعد آپ کی غزل پھر دیکھی۔ اور آپ کی سخت تنقید، کی فرمائش پر بہت مزہ آیا۔ چاہیے تو یہ تھا، اور آپ بھی شاید یہی چاہتے ہوں، کہ "خیام" میں تنقید کروں لیکن یہ طول امل بھی ہے اور طول عمل بھی۔ بڑا مضمون لکھنا پڑے گا۔ اتفاق سے اس "خیام" میں آپ پر اور دوسروں پر تنقید کا سامان بھی ہے، یعنی آپکی زمین ——— "وہ ایک لمحہ سہی ایک لمحہ کیا کم ہے" مشاعرہ کانپور کی چار غزلوں میں مشترک ہے۔ ایک آپ کے ہم وطن اثر رامپوری ہیں، دو مشہور شاعر اثر لکھنوی اور ادیب سہارنپوری ہیں۔ سب کو لپیٹنا اور اپنے آپ کو الجھانا

پڑے گا۔

اس لیے سوچا کہ آپ ہی کو لکھدوں۔ لیکن آپ کا پتہ معلوم نہیں تھا، اس لیے وسیلہ تلاش کیا ہے۔ آپ نے غزل "کہ نہیں" سیماب صاحب سے بہت بہتر کہی ہے۔

سیماب صاحب پرانے اسکول کے استاد ہیں۔ جو کچھ جدت پیدا کرتے ہیں الفاظ وتراکیب کی تمام تر خراش سے کہتے ہیں۔ نفس مضمون کی جدت و لطافت اور اسلوب کی تازگی بہت کم پیدا کر سکتے ہیں۔ سیماب صاحب کی غزل کو آپ کی غزل سے کوئی نسبت نہیں۔ آپ کی پوری غزل خوب ہے۔ پانچ شعر انتخاب کیے ہیں۔ تینوں مطلعے اور پانچواں ساتواں شعر۔ چھٹے شعر کی بات اچھی تھی مگر "ہر ایک شے کا تماشہ" ذرا ہلکا اور مبہم ہے۔ "گناہ" کی وضاحت نہ ہوئی۔ "درد کی پکاروں" "عصر حاضر کی وسعت آفرینی ہے۔ میں پہلے تو بہت بھڑکتا تھا، اب مانوس ہوتا جاتا ہوں۔

دوسری زمین میں بھی آپ ہی کی غزل بہتر ہے۔ سب سے پرانے شاعر اثر لکھنوی کی غزل سب سے ہلکی ہے .... آپکی غزل کے بعد ادیب سہارنپوری کی غزل ہے .... ادیب کے بعد اثر رام پوری اور عمر لکھنوی کی غزلیں ہیں ...... اثر صاحب کے "برہم ہے" "فاصلہ کم ہے" اور "مدھم ہے" اچھے ہیں .... عمر صاحب کے مقطع میں "اسیر" اور "میعاد" کی مناسبت "لکھنویت" ہے مگر بر محل صرف ہوئی۔ یہ بات آپ ہی نے خوب کہی ہے۔ "وہ ایک لمحہ سہی، ایک لمحہ کیا کم ہے"۔ آپکی فکر و تخیل میں میں نے ایک اور بات محسوس کی۔ آپ دوسرے مصرعے میں بہت اچھا کہتے ہیں۔ اور یہ شاید پہلے کہتے ہیں۔ پہلے مصرعے ہر جگہ ایسے حسین نہیں ہوتے۔ کہیں کچھ کسر بھی رہ جاتی ہے۔ مثلاً ـــــ "حدود دیر و حرم سے گزر چکا شاید" کون؟ فاعل مذکور نہیں۔ یہ تبصرے مضمون کی صورت میں لکھتا تو بہت پھیل جاتے۔ (۲۳ مارچ ۶۴ء)

امتیاز علی عرشی

میں بہت ہی خشک آنکھوں کا آدمی ہوں۔ ابتک ایسے موقعے بہت کم آئے اور میرا خیال ایسا تھا کہ اب میری زندگی میں کوئی ایسا آدمی نہیں مرے گا جسکی موت پر میری آنکھیں اشکبار ہوں، مگر خدا جانے اس شخص میں کتنا اخلاص تھا کہ مجھے اب بھی رونا آتا ہے۔ وہ شاعر، صحافی، یا محقق اتنے بڑے ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن ان کے جذبۂ اخلاص نے مجھ جیسے سخت دل کو بھی متاثر کیے بنا نہ چھوڑا ——— اور خدا نہ کرے اب میں کسی کی ایسی موت ان آنکھوں سے دیکھوں۔ بڑا مبارک ہے وہ شخص جو دوسروں کے دلوں پر ایسا گہرا اثر چھوڑ جائے۔

وہ لڑکپن سے شاعر تھے اور شعر گوئی میں اتنا وقت صرف کیا کہ شاعرانہ مزاج ہو جاتا مگر ان میں یہ استعداد و صلاحیت تھی جسے میں طالب علمانہ صلاحیت کہتا ہوں کہ جب ان کے دوستوں نے یہ مشورہ دیا کہ اب قوم کو شاعروں کی ضرورت نہیں نثاروں کی ضرورت ہے تو انھوں نے داستان پر، رام پور اسکول اور بعض دوسرے اہم موضوعات پر ایسا کام کر ڈالا جو شاعروں کے بس کا نہیں تھا ——— اور ہمارے سب نوجوانوں کو یہ بات گرہ میں باندھنی چاہیے کہ وہ لکھتے ہوئے مرے اس منحوس صبح کو بھی انھوں نے اپنے آخری مضمون کا ایک حصہ لکھا اصل جہاد یہ ہے! طالب علم کی موت! میں تو خدا سے دعا کرتا ہوں کہ پروردگار، میری موت بھی اسی طرح ہو!

اور صاحبو! زندہ کا جشن مناؤ تو کیا ہوگا اور مردہ کا یوم مناؤ تو کیا۔ یہ سب ذہنی باتیں ہیں اصل کام تو یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک بھی ان کی اس روش اور ان کے کام کو آگے بڑھائے

فارسی کا ایک شعر ہے: نام نیک رفتگان ضایع مکن ؎ تا بماند نام نیکت برقرار

ایسی قوم کے مردے بھی زندہ رہتے ہیں اور جس قوم میں یہ نہیں اس کے زندے بھی مردہ ہیں۔

۱۹۶۳ء

اسلم خاں

بڑے شاعروں کو جب میں رام پور کے اچھے شعر سناتا تو ان میں سب سے زیادہ راز صاحب ہی کے شعر

ہوتے۔ اور اگر باہر سے میرے یہاں کوئی صاحب علم آتا جسے مجھے رام پور کی شاعرانہ عظمتوں سے مرعوب کرانا منظور ہوتا تو میں ہمیشہ راز صاحب ہی کو پیش کرتا۔

میرے منھ سے بڑی مشکل سے کسی شاعر کی تعریف نکلتی ہے، جب تک بحیثیت انسان بھی اسے اچھا نہ سمجھوں۔ میں نے راز صاحب کو انسان بہت اچھا پایا۔ وہ بڑی مشکل سے کسی کی برائی میں آپ کا ساتھ دیتے۔ ساتھ دیتے بھی تو آخر میں کہتے "یار آدمی بہت اچھا ہے" اور یہ جملہ وہ بڑے خلوص سے کہتے۔ (۱۹۶۳ء)

مشفق خواجہ

کئی دن ہوئے راز یزدانی کے انتقال کی خبر مل گئی تھی، میں اسی سوچ میں گم رہا کہ تعزیت کا خط کسے لکھوں، "نیا خواب" میں آپ کا مضمون پڑھ کر یہ خیال آیا ہے کہ کیوں نہ آپ ہی کو اپنے غم میں شریک کر لوں۔ مجھے راز صاحب کے انتقال کا شدید ملال ہے، آپ خود ہی سوچیے کہ ہمارے لکھنے والوں میں کتنے افراد صاحب نظر ہیں اور راز صاحب تو صحیح معنوں میں صاحب نظر تھے، اس عہد کم مایہ میں راز جیسے فرد کا بساط عالم سے اٹھ جانا بہت بڑا سانحہ ہے۔ ابھی پچھلے دنوں نقوش میں مجمع النفائس کے بارے میں ان کا مضمون پڑھا تھا، کیا خبر تھی کہ یہ اُن کی آخری تحریر ہوگی۔ میں آپ کو یہ سطور لکھ رہا ہوں اور میرے سامنے راز مرحوم کا ایک خط مورخہ ۲۲، ۹، ۶۲ رکھا ہوا ہے۔ یہ جواب طلب خط تھا — مرحوم کا پہلا اور آخری خط جو انھوں نے مجھے لکھا — میں اسی سوچ میں گم رہا کہ اس خط کا کیا جواب لکھوں اور کاتب اجل کو پیارا ہو گیا۔ اب آپ ہی بتلائیے کہ خط کا جواب نہ دینے کی معذرت کس سے کروں!

آپکا: مشفق خواجہ ۸/۳/ ۱۹۶۳ء

عابد رضا بیدار

یہ راز یزدانی کی غزلوں اور نظموں کا انتخاب ہے۔ انتخاب کی ضرورت کو ہر زمانے میں محسوس کیا جاتا رہا ہے۔ پہلے اسے بیاضوں اور تذکروں کی صورت میں پیش کیا جاتا تھا۔ پھر حالی کے بعد سے یہی انتخاب تنقیدی کتابوں اور طویل تنقیدی مقالوں میں جگہ جگہ بکھرا ہوا ملنے لگا۔ یہ روش "یادگارِ غالب" سے شروع ہوئی اور اب تک کسی نہ کسی حد تک قائم ہے۔ جدید اردو تنقید اس روش کو بالکل ترک کرنا چاہتی ہے اور نیا رجحان تو اتنا شدت پسند ہوتا جا رہا ہے کہ ایک معیاری تنقیدی مقالے کے لیے یہ بھی ضروری فرض کر لیا گیا ہے کہ اس میں کم سے کم مثالیں پیش کی جائیں، اور یہ "کم سے کم" بتدریج "بالکل نہیں" بنتا جا رہا ہے۔

ایک اچھے تنقیدی مضمون میں اشعار کی بھرمار ہونا کبھی نہیں چاہیے لیکن لکھنے والا اشعار کو قطعاً نظر انداز تو نہیں کر سکتا۔ ناقد کا پہلا کام تفہیم ہے، تنقید کا درجہ اس کے بعد ہے۔ اس کا سب سے زیادہ اہم فرض تو شاعر کو متعارف کرانا اور اس کے تجربات کو دوسروں تک پہنچانا ہے پرکھ کا کام اس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اور اس تفہیم و تعارف میں اشعار کا انتخاب ناگزیر سا ہو جاتا ہے۔

بیاضی انتخاب، اور تنقیدی انتخاب سے ہٹ کر سب سے زیادہ سلجھا ہوا انتخابی سلسلہ سب سے پہلے حسرت موہانی کے یہاں ملتا ہے جو بیاض اور تذکرے سے تھوڑا سا مختلف ہے۔ حسرت کا انتخاب عموماً ایسا ہوتا ہے کہ پھر اصل کتاب کو دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی وہ ایک طرح سے مختصر سا دیوان ہوتا ہے۔ حسرت کا یہ کام بڑا وقیع ہے، اور کوئی تحقیقی کام کرنے والا حسرت سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، اَن گنت شاعر جن کا کوئی نام بھی نہ جانتا، آج حسرت کی بدولت زندہ ہیں اور ان کا کلام محفوظ ہے۔ تاہم حسرت کے انتخاب میں ایک خرابی تھی وہ "شعر" سے زیادہ ہیئت کے قایل تھے، ہر غزل کا مقطع اور مطلع ضرور انتخاب میں لیتے چاہے وہ تیسرے درجے ہی کے کیوں نہ ہوں اور اس غزل کو چھوڑ دیتے جس کا مطلع اور مقطع ان کے انتخاب میں نہ آسکے، اس طرح بہت سے اچھے شعر چھوٹ جاتے تھے، پھر بھی ان کے کام کی اہمیت سے مکرنا بڑی جسارت چاہتا ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے دوسروں میں انتخابی ذوق پیدا کر دیا، مولوی عبدالحق اور نیاز فتحپوری مثال میں پیش کیے جا سکتے ہیں، دوسری طرف محمود علی خاں جامعی کے انتخابات اور متعدد "سو شعر" اور "سوا سو شعر" بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ بالکل تازہ مثال قاضی عبدالغفار کے مرتبہ انتخابات (مخدوم، وجد، اور غزل) ہیں۔

نقائص سے قطع نظر حسرت میں ایک بات ضرور تھی وہ شاعر

کی شہرت کو اپنے انتخاب کا معیار نہیں بناتے تھے، ان کا معیار صرف شاعر کا کلام تھا بالکل گمنام شاعروں کو بھی منظر عام پر لاتے ہوئے وہ کبھی نہیں جھجکے۔

حسرت کے بعد انتخاب کرنے والوں میں یہ بات نہیں رہی قاضی عبد الغفار نے البتہ ایک قابل تعریف اقدام کیا ہے وہ دوسری اور تیسری صف کے شاعروں کو آگے لا رہے ہیں۔ زبان کو آگے بڑھانے اور ادب کو حسین سے حسین تر بنانے کے لیے بلاشبہ یہ ایک اقدام ہے لیکن اس سے زیادہ توجہ کے مستحق وہ شعرا ہیں جنھیں کسی نہ کسی وجہ سے بارگاہ ادب میں کوئی خاص مقام نہ مل سکا جبکہ ان کے اشعار قدم قدم پر اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ وہ قدر اول کے شاعر ہیں۔ راز یزدانی اسی زمرے میں ہیں، ان کے مجموعۂ کلام (حرب وضرب) کو شایع ہوئے پندرہ سولہ سال ہو گئے مولوی عبد الحق، نیاز فتحپوری اور حامد حسن قادری نے اسے اردو ادب میں اضافہ قرار دیا۔ مولوی عبد الحق نے محسوس کیا کہ یو۔ پی والے بھی اقبال پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن آج کتنے جانتے ہیں کہ "حرب وضرب" نام کی کوئی کتاب اردو نظم میں موجود ہے ــــ؟

(احمد ولی خاں) راز ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے مقام پیدائش بریلی کی تحصیل بہیڑی ہے لیکن یہ شیر خواری ہی میں رام پور آ گئے، ۱۹۲۵ء سے باقاعدہ شاعری شروع کی، بیان یزدانی میرٹھی کے شاگرد

عیاں میرٹھی سے اصلاح لی، ۱۹۳۴ء کے کچھ بعد تک ان کا کلام برابر رسائل میں آتا رہا، اسی زمانے میں سائمن کمیشن اور اقبال کے سلسلے میں انھوں نے ایک قطعہ شایع کرایا، اقبال نے "انقلاب لاہور" میں 'ناظم ادب آموز سے خطاب' کے عنوان سے اس کا جواب لکھا، راز نے اس پر پھر ایک قطعہ لکھا۔ یہ وقتی رنجش تھی اور بعض غلط فہمیوں کی بنا پر، ویسے وہ اقبال کی عظمت کے قائل تھے اور اپنا معنوی استاد سمجھتے تھے۔

۱۹۴۰ء میں انھوں نے اپنے کلام کا پہلا مجموعہ "حرب و ضرب" ترتیب دیا جو ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا یہ مجموعہ 'پہلی جنگ کے خاتمہ اور دوسری جنگ کے آغاز' کے درمیانی وقفہ کی فضا کی پیداوار ہے، اس میں شاعر کی گہری سیاسی بصیرت کے ساتھ ساتھ ان کی تلخ گھریلو زندگی اور معاش کی طرف سے بے اطمینانی جگہ جگہ نمایاں ہے — راز ادب میں غالب کے پرستار ہیں لیکن میر کے معتقد نہیں! امیر مینائی اور مومن کے آرٹ کے مداح ہیں، بیسویں صدی کے غزل گو شعرا میں اصغر گونڈوی سے بے حد متاثر ہیں، دوسرے شاعروں میں حسرت و جگر کو پسند کرتے ہیں، نظم میں صرف اقبال کے قائل ہیں، ان کی اپنی شاعری میں غزل پر سب سے گہرا اثر اصغر کا ہے اور مومن کا اسلوب ادا اور غالب کا سا تفکر اور ناقدانہ انداز ملتا ہے۔ کسی کے رنگ تغزل کا تجزیہ اتنا آسان نہیں، راز کی غزل بھی محض غالب، مومن اور اصغر کا مجموعہ نہیں یہ اس کے علاوہ بہت کچھ ہے، اس میں خود راز کی شخصیت ہے اور نئے سماج کی روح۔ نظم میں اقبال کا حیرت انگیز کامیاب تتبع ہے،

پنے مسلک اور فکر میں وہ اقبال سے بہت زیادہ قریب ہیں، شاید اسی وجہ سے
فیں اس رنگ میں اتنی کامیابی ہوئی (مسلک اور فکر کے سلسلے میں اتنا عرض کردوں
۱۹۴۷ء کے بعد راز کے یہاں شاہین کے لیے شکار عصفور کا جواز، انہیں ملتا۔
ب وہ کس طرح سوچتے ہیں، اس کا اندازہ کسی قدر قطعات سے ہو سکے گا)

راز کے یہاں عجیب تر بات یہ ہے کہ ان کی غزل غزل رہتی ہے اور نظم نظم
غزل میں گھلاوٹ، نرمی شیرینی اور سادگی ہے، نظم میں بلند آہنگی، شکوہ اور "پیغمبرانہ" انداز
یہ بات اقبال سے بھی نہ نبھ سکی" بالِ جبریل" اور "ضرب کلیم" کی غزلیں اور نظمیں بالکل
یک رنگ میں ہیں، اگر "بانگ درا" کی غزلوں میں یہ بات ملتی بھی ہے تو گنتی کے چند
اشعار کو چھوڑ کر ان میں وہ بلندی نہیں۔

میں نے اس کتابچے میں راز کی غزل سے زیادہ انتخاب کیا ہے اور نظم سے کم،
اور فطرتاً راز ایک غزل گو ہی ہیں" میں اچھی نظم کا قایل ہوں لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ ہمارا
ادبی ورثہ غزل ہی کی صورت میں ہے اور یہ بھی کہ اب تک ہمارا ادبی معیار غزل ہی ہے۔
شاعری کا انتخاب اور خصوصاً غزل کا انتخاب اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے! یہ
انتخاب ایک وقت میں تو ممکن ہی نہیں، میں نے راز کے کلام کو بار بار دیکھا ہے،
اور کوشش کی ہے کہ انتخاب دوسروں کی نہیں اپنی نظر سے کروں۔ میں شاعری میں
دل کو دماغ پر ترجیح دیتا ہوں، گو آخر الذکر کو قطعاً نظر انداز نہیں کرتا! تاہم میرا خیال
ہے کہ شعر میں دھڑکتا ہوا دل پہلے ہونا چاہیے، سوچتا ہوا دماغ بعد میں ـــ غزلگو
شاعر راز جب میں غزل کا شاعر کہتا ہوں تو میرے سامنے ایک مخصوص معیار ہوتا ہے!
ایک خاص نہج سے دنیا کو سنوارنے کا عزم رکھتا ہے، اس کی پالیسی صلح کل کی پالیسی

ہوتی ہے وہ صرف انسان کو دیکھتا ہے، انسانوں سے کہتا ہے، انسانوں کی بابت کہتا ہے، اور انسانوں کی سی کہتا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ الہامی نظاموں کے بعد اگر کوئی جزا قسم کا نظام بنایا گیا، جو دنیا کو رہنے کے قابل بنا سکے، تو وہ غزل کا نظام ہوگا۔ کسی بھی اچھے غزل گو کو پڑھیے وہ کبھی آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔ راز کو پڑھیے آپ کو جینے کا سلیقہ ملے گا، اور انسانوں سے انسانیت کی بنیاد پر ملنے والی راہیں۔ غالب اس لیے بڑا شاعر نہیں کہ اس نے طرز بیدل میں ریختہ کہا، یا معمے بنائے یا پہیلیاں بجھائیں۔ غالب اس لیے قابل قدر ہے کہ اس نے انسانوں کی روحوں کو ہم آہنگ ہونے میں اردو کے قدیم شاعروں میں سب سے زیادہ مدد بہم پہنچائی اور اب تک اس کا یہ کام جاری ہے۔ غزل انسانیت کی علمبردار ہے، وہ انسانیت کی روح ہے ——— لیکن غزل کے حسن سے مبہوت ہو کر نظم کے حسن کو نظر انداز کر دینا انتہا پسندی ہوگی۔ ادبی دیانت داری کا تقاضا ہے کہ حسن جہاں کہیں ہو نا قد اس کا پرستار رہے۔ یہاں راز کی اچھی غزلوں کے ساتھ اچھی نظموں کا انتخاب بھی پیش کیا جا رہا ہے۔

کوشش کی گئی ہے کہ موجودہ اختصار پسند دنیا اس انتخاب سے بآسانی فائدہ اٹھا سکے۔

(جنوری ۱۹۵۴ء)

۱۳ر جنوری ۱۹۶۳ء کو کانٹوں کو پھول اور خزاں کو بہار بنانے کا تمنائی راز یزدانی ہمیشگی میں میں جا ملا۔ رہے نام اللہ کا!

عابد رضا بیدار - یوم اقبال ۱۹۶۳ء

پیشگفتار

۱۹۴۵ء کے قریب کلام موزوں اور ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ شاعری شروع کی۔ اس زمانہ کی دو تین اُستادانہ غزلوں میں ایک "نام سے ربط" "دشنام سے ربط" ردیف قافیہ کے ساتھ اب تک یاد ہے۔ ایک طرحی غزل کا مقطع یاد آرہا ہے:

نہ جانے کس نے یہ عابد کو کر دیا بیدار
چلا ہے جیسے ہو شاعر غزل سنانے کو

ایک اور غزل کا ایک عاشقانہ شعر (بچارہ بجائے بے چارہ، بے اُستاد ہونے کی غمازی کر رہا ہے) ایک عزیز نے ابھی چند روز ہوئے دہرایا:

محبتوں کی کشاکش، مصیبتوں کا ہجوم
ترا مریض بچارہ بڑے عذاب میں ہے

ایک سیاسی قسم کا شعر لگ بھگ اُسی زمانہ کا ہے:

تھیں سمائی کہاں ساقی وبہار کے ساتھ
جنوں کی لاج بھی رکھّی تو ہم غریبوں نے

غرض سال میں آٹھ دس غزلوں کی اوسط سے شاعری چلتی رہی۔ احمد کا دش، لارنس، معراج، رشید، اکبر اور بھائی محمود رضا خاں کا ساتھ تھا، شاعر کو داد بھی ملتی رہی اور اصلاح بھی۔ پھر علی گڑھ میں میکڈانل شور اور ہنگاموں کا گڑھ بنا رہا۔ اکبر، اعجاز، باقر عنایتی، ظہیر، عابد احمد غازی — اب تو سب بکھر گئے۔ میکڈانل اُس وقت کتنا عزیز تھا اور اس کی یاد اب بھی ہم سب کے لئے کتنی قیمتی ہے، اس کا اندازہ شاید کوئی اور نہ کر سکے۔ میکڈانل کو چھوڑتے وقت سب پہ کیا گذری، وہ لوگ جانیں، میرا تو دل بیٹھا جا رہا تھا۔ جگہوں سے بھی کیسی وابستگی ہو جاتی ہے! اس دن میں نے جو نظم کہی:

"میکڈانل تری رونق ترے انداز چلے"

اپنے کچے پن کے باوجود مجھے اب بھی عزیز ہے۔

ادھر کئی سال سے ذہن میں ایک بات بیٹھ گئی ہے کہ کوئی بات شعر میں کہی جائے تو اس سے سماجی شعور کے ارتفاع میں مدد ملے، یا ایسی انجانی مسرت ہو یا خلش یا کسک — جو اول الذکر کا بدل بن سکے تو وہ شعر ضرور کہے جانے کے لائق ہے، ورنہ بن کہا یا بن لکھا ہی بہتر ہے۔ دوسروں کے لئے بھی یہی سوچتا ہوں، اور اس سے زیادہ اپنے لئے۔ شعر گفتن چہ ضرور! حکیم کا نسخہ ہو تو دوسری بات ہے!!

تیس ۳۰ سال —— ایک خود نوشت

میرا پہلا معلّم، میرا پیارا باپ
گونج اٹھی اس کے قدموں کی بھاری چاپ
گونج کو لے کر وقت کے سائے پھیل گئے

میرا پہلا معلّم، میرا پیارا باپ
لرز اٹھی اس کے قدموں کی مدھم چاپ
مدھم چاپ پہ شاید سائے ٹھہر گئے

کس نے ایسا چاہا جو میں چاہوں گا

(اپنا چاہا کب ہوتا ہے یارو)

میں تو جب بھی چاہوں بس یہ چاہوں گا
لرزا اُٹھی ہے قدموں کی جو مدھم چاپ
میرے دِل کا درد مرے افکار کا گیت
میرے کانوں کی موسیقی بنی رہے
میرے دِل کا درد مرے افکار کا گیت!
کوئی بدل دے کاش مری دُنیا کی ریت!!

لرزا اُٹھی ہے قدموں کی جو مدھم چاپ
اس کو بھی ڈس لے گا آخر وقت کا سانپ

سات برس کی آٹھ برس کی عمر ہی کیا!
لیکن دل پہ نقش ہے اَب تک ساری بات
کتنی وحشت خیز یہ کتنی کاری بات
میرے پہلے مُعلّم کی دو دھاری بات
کبھی نہیں ہے وقت کے پہیے کو ٹھہراؤ
کس کے رُکائے رُکا ہے اس دریا کا بہاؤ

لمحہ فانی بھی، لمحہ ہی ابد قرار
لمحہ میں دُنیا، لمحہ کا سب بیوپار
آج ہمیشہ کل ہی میں ڈھلتا جاتا ہے
مجھے، تمھیں، یہ وقت بدلتا جاتا ہے
ہر فانی لمحہ کو ابد بناتے جاؤ
دُنیا کو سمجھو، پر تو ٹھکراتے جاؤ

آج کی محفل کل کا مدفن ہونا ہے
جو کچھ پایا آج وہ کل کو ہونا ہے
وقت خدا ہے وقت سے غفلت ٹھیک نہیں!

عزیزے کہ از درگہش سرتبافت

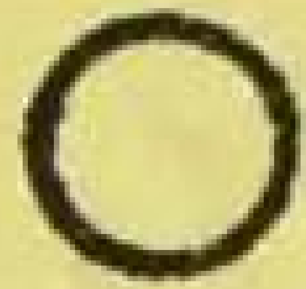
نہ میرا رونا، نہ میرا ہنسنا، نہ سوچ سکنا نہ بات کرنا
مرا تو کچھ بھی نہیں رہا ہے، کوئی سلیقہ، کوئی قرینہ
خزاں کا ڈر ہے نہ پہلا جیسا، نہ کوئی لطفِ بہار اپنا
نہ اب وہ پہلے کے بے کراں خواب ہیں، نہ خوابوں کا روِ مجانا
عجب طرح زندگی کے لمحات زندگی کو کچل رہے ہیں
گندھا ہوا ایک دوسرے سے لپیٹ میں تیسرے کو لینا
نہ سانس لینے کی کوئی فرصت، نہ بات کہنے کی کوئی مہلت
نہ تاب نظارہ جہاں ہے، نہ اپنا مرنا نہ اپنا جینا

کہاں ہے تو، دل پکارتا ہے، پکارتا ہے، پکارتا ہے
پکارتا ہے کہ بازگشتی صداؤں کا ہی فریب کھائے
مگر یہ کتنے دلوں کی، کتنی صداؤں کا مستقل دفینہ!
مگر یہ گنبد، یہ گنبد ماہ و سال، دن رات کا سفینہ!



اہلِ دل دورِ خرد ختم ہوا کھل کے کہو
سُننے والے اب اشارات سے گھبراتے ہیں

(۱۹۵۱ء)



شبِ غم کی یہ سیاہی ابھی اور کچھ نکھر لے
شبِ غم کبھی ملے گی، مجھے یہ اُمید کم ہے

(۱۹۵۲ء)



اپنی حد تک تو جو کچھ ہم سے بن آیا وہ کیا
دوست، پر تو نے وفاؤں کا صلہ خوب دیا

(۱۹۵۴ء)



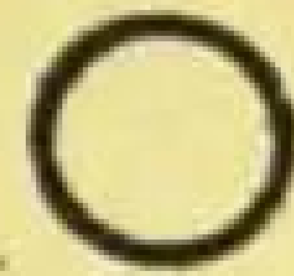
سارا ماضئ مرحوم جیسے ہنس رہا ہو آج
اک تو ہی نہیں اے دوست مجھ پہ خندہ زن تنہا

کچھ خلوص، کچھ جذبہ، کچھ یقیں ضروری ہے
کتنے تاج بن پائے سنگ و خشت و فن تنہا

راہزن بھی رہرو تھا، رہنما بھی ہو شاید
کاش تم نہ کہہ اٹھتے اس کو راہزن تنہا

اعتماد سے پیدا اعتماد ہوتا ہے
دیر تک نہیں چلتا ایک حسنِ ظن تنہا

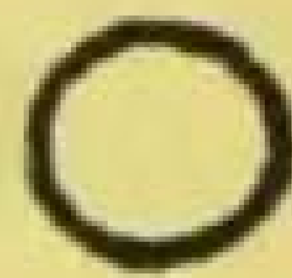
(۱۹۵۵ء)



کرم اور کرم نمائی میں کچھ امتیاز ہو لے
تجھے چھوڑنا پڑا ہے، مجھے خود بھی اس کا غم ہے

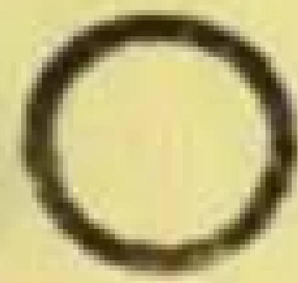
(۱۹۵۶ء)

۱۵



پھر وہی شب کی ظلمتوں کے امیں
گلۂ شبِ دراز کر بیٹھے

(۱۹۵۷ء)



ہر راہ رو کو تکتے ہیں کن حسرتوں کے ساتھ
کتنے اداس ہیں مری منزل کے راستے



تُو نے بخشی مجھے بے نام تمنّا کی خلش
دل تجھے کھو کے بھی ناشاد نہ ہو پایا کبھی

(۱۹۵۸ء)



کتنی حسرت ہے کہ دل حسبِ تمنا اب تک
کوچۂ یار میں برباد نہ ہو پایا کبھی

(۱۹۵۹ء)



تمہاری چشمِ کرم کا بڑا سہارا تھا
اس اِک سہارے سے ہم دُور تک نکل جاتے
سفر نصیب کا تھوڑا سا تو دے دیتے
تو اس کی زیست کے عنوان تک بدل جاتے
اور اب تو یادوں کی پرچھائیاں بھی پاس نہیں
کہ ہم بہکتے بہکتے بھی کچھ سنبھل جاتے
تمہارے ذکر سے لوگوں کے دل بہلتے ہیں
ہم اپنی بات سُناتے تو دل پگھل جاتے

(۱۹۵۹ء)



تم اپنے منھ سے محبت کا لفظ مت بولو
جو سن لیا تو کوئی اعتبار کرے گا

(۱۹۶۰ء)



تمہارے منہ سے محبت کا لفظ ہائے نصیب
اور اس کو سن کے کوئی اعتبار کرے تو!

(۱۹۶۳ء)



دِل مالک کا مندر ہے، دِل مالک کی سوغات
جنم لیے پر، میری تیری، اسکی، سب اک جات
ڈوب ڈوب کر سورج اُبھرا، دن سے نکلی رات
کوئی بُرا نا کوئی اچھا! سمے سمے کی بات!!

(۱۹۶۴ء)

Selections

from Rampur Poets

* qAyem chAndpuri
* taskeen dehlvi
* Mirza ghAlib
* rAz yazdAni
* bedar

RAMPUR INSTITUTE OF ORIENTAL STUDIES
1806 - Kalan Mahal, Delhi-6
1970